سیّد آلِ رضا کے خطوط اور اصلاحیں

سیّد وحید الحسن ہاشمی

سیّد آلِ رضا کے خطوط اور اصلاحیں

(تحقیق و تنقید)

سیّد وحید الحسن ہاشمی

''میں تو جو کچھ آپ کو کبھی تحفہ دیتا ہوں وہ آپ کے لیے ہوتا ہے۔ اگر میری تحریر یا گفتگو اس مسئلے میں شائع کرنا ہو تو مجھے آپ مطلع کر دیا کریں تاکہ جو کچھ لکھوں یا کہوں وہ موقع کے لحاظ سے تشنہ نہ ہو۔ میرے مشاہدے اور حافظے میں تو ایسی ایسی باتیں ہیں کہ اگر بیان کروں تو ایک دفتر ہو جائے''۔

مکتوب سید آل رضا بنام سید وحید الحسن ہاشمی

کراچی ۲۴ فروری ۱۹۶۸ء

سیّد آلِ رضا کے خطوط اور اصلاحیں

(تحقیق و تنقید)

سیّد وحید الحسن ہاشمی

الحسن پبلی کیشنز

۲۵۳۔ ایف رحمان پورہ لاہور، پاکستان

حقوق اشاعت محفوظ ۲۰۰۴ء

سیّد آلِ رضا کے خطوط اور اصلاحیں

سیّد وحید الحسن ہاشمی

ناشر

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن

طابع

رضا سنز پرنٹرز شمع پلازا فیروز پور روڈ لاہور

کمپوزنگ

سیّد محسن رضا

سرورق

سیّد علی رضا

قیمت ۲۰۰ روپے

یکے از مطبوعات

الحسن پبلی کیشنز: ۲۵۳۔ایف رحمان پورہ لاہور۔فون: ۷۵۸۰۶۴۳

انتساب

عالیجناب سیّد ہاشم رضا مرحوم

کے نام

قطعہ تاریخ

(بہ سلسلہ اشاعت کتاب بہ عنوان "آلِ رضا کے خطوط اور انکی اصلاحیں")

ساحر لکھنوی

کی حضرت وحیدؔ نے تصنیف جو کتاب
تحفہ بروحِ آلِ رضا بے بہا ہے یہ
ساحرؔ تھی جستجو جو مجھے سالِ طبع کی
تاریخ یہ پکاری کتابِ رضا ہے یہ

۱۴۲۳ھ

قطعہ تاریخ

(بہ سلسلہ اشاعت کتاب بہ عنوان "آلِ رضا کے خطوط اور انکی اصلاحیں")

نیساں اکبر آبادی

اصلاحیں لی ہیں آلِ رضا سے وحیدؔ نے
شاعر ہیں پختہ مشق، کہے مرثیے کئی
اس کو کتابی شکل میں لائے ہیں میرے دوست
اصلاحیں اعلیٰ آلِ رضا کے خطوط بھی

۲۰۰۲ء

مندرجات

چند معروضات ۹

خطوط نگاری کا فن اور سیّد آلِ رضا ۱۱

خطوط نویسی کے مدارج

خطوط کے متنوع روپ

آلِ رضا کے خطوط کے محاسن

آلِ رضا کے خطوط کی تدوین ۳۳

(۲۲۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء تا ۴۔ دسمبر ۱۹۷۷ء)

آلِ رضا کی اصلاحیں ۱۸۱

اشاریہ ۲۰۱

(سید وحید الحسن ہاشمی کی شخصیت اور فن پر لکھی گئی تحریریں)

مرتبہ: عباس رضا

سید آلِ رضا

ڈاکٹر عاصی کرنالی

فن اس کا آئینے جیسا مجلّا
مثال اُس کی نہیں حاشا و کلّا

سلام اُس کے رفیع المرتبت ہیں
غزل اُس کی معلّٰی ہی معلّٰی

مراثی میں وہ نکتہ سنجیاں ہیں
کہ اک اک بیت کا بھاری ہے پلّہ

قلم اُس کا جہادِ حق میں مصروف
شکستِ کفر و باطل اُس کا ہلّہ

دیا آلِ رضا نے مرثیوں سے
جدید انسان کو درسِ تولّا

کیے منقوش وہ زرّیں خیالات
بنے اوراق اوراقِ مطلّا

قدم جب شعر کے میداں میں رکھا
کہا اُس نے توکلت علی اللہ

توکّل کا یہ ثمرہ ہے کہ وہ شخص
زمینِ فن پہ ہے عرشِ معلّٰی

پڑھا جب شعرِ پُر تاثیر اُس نے
پکارے اہلِ محفل اللہ اللہ

وہ اُس کے خامے کی گُل آفرینی
کہ تھا گلرنگ ہر علمی مجلّہ

عقیدت کی جبیں ہے سجدہ در کف
بیاضِ فن ہے اُس کی یا مصلّا

وہ اہلِ ذوق کی جاں میں ہے آباد
ہے ہر دل اُس کا گھر اُس کا محلّہ

زمانے ! یا تو اُس کا معترف ہو
نہیں تو ایسے شاعر کا بدل لا

چند معروضات

بیسویں صدی میں اردو شعری روایت کو استحکام بخشنے والے شعرا میں سید آل رضا کا نام انتہائی اہم ہے۔ آل رضا نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی تاہم مرثیہ اور غزل میں ان کی تخلیقی صلاحتیں بھرپور طریقے سے ہمارے سامنے آئیں۔ ان کی غزلوں اور مرثیوں میں محض روایت کی پاسداری ہی نہیں ملتی بلکہ ان میں ان کی جدت طبع کے جوہر بھی نمایاں ہوئے ہیں۔ آل رضا کی یہی روایت سازی انہیں اپنے ہم عصر شعرا میں ممتاز بنا دیتی ہے۔

آل رضا کی شخصیت اور فن پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ خاص طور پر راقم الحروف نے ان کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے ۱۹۶۳ء میں ایک کتاب مدوّن کی تھی جس میں اس عہد کے تمام نامور ناقدین اور دانشوروں کے مقالات شامل تھے۔ اسی طرح میرے صاحبزادے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے پہلے ''آل رضا کا فن غزل گوئی'' کے نام سے آل رضا کی غزل گوئی کا مبسوط جائزہ کتابی شکل میں پیش کیا پھر انہوں نے ''باقیات آل رضا'' کے نام سے ان کا غیر مدوّن کلام تحقیقی معیار کے مطابق یکجا کر کے ایک اہم تحقیقی کارنامہ سرانجام دیا۔ یہ تمام باتیں اس امر کی غماز ہیں کہ ہمارے خاندان کا آل رضا سے قلبی اور فنی رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے اور اب جناب آل رضا کی محبت نسلوں میں منتقل ہو چکی ہے۔

آل رضا سے میری خط و کتابت 'نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں'۔ میری بدنصیبی یہ ہے کہ میں اپنے استاد ذی وقار کے تمام خطوط محفوظ نہ رکھ سکا تاہم جتنے خطوط دستیاب ہو سکے انہیں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ان خطوط میں آپ کو شاید حیرت

انگیز معلومات اور رنگا رنگ واقعات نہ مل سکیں لیکن ان خطوط میں ایک زمانہ اور عہد محفوظ ہے۔ ان خطوط میں آل رضا کی علمی صلاحیتوں کا احساس ہوتا ہے اور ان کی نکتہ سنجیوں کا معترف ہونا پڑتا ہے میں نے خطوط کے آغاز میں ہر مکتوب کا مختصر پس منظر بھی بیان کر دیا ہے اور ہر قسم کی ملمع سازی سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ بعض مقامات پر تعلّی کی جو صورت ابھرتی ہے اس کے لیے میں پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں بہت سے احباب نے میری معاونت کی ہے ان میں محسن رضا' علی رضا' جناب رونق رضا' عباس رضا' اور جاوید پبلشرز کے جناب جاوید اقبال شامل ہیں۔ اب میں عمر کی اس منزل میں ہوں جہاں مجھے ایسے ہی دست و بازو درکار ہیں۔

آخر میں میں اپنے تین دوستوں اور مہربانوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ جناب ڈاکٹر عاصی کرنالی نے اس کتاب کے لیے خصوصی طور پر ایک مرصع نظم عطا فرمائی ہے۔ اسی طرح جناب ساحر لکھنوی اور جناب نیساں اکبر آبادی نے اس کتاب کے قطعات تاریخ پیش کر کے میری عزت افزائی فرمائی ہے میں ان تمام احباب کا بے حد شکر گزار ہوں۔

میں یہ کتاب اپنے محسن اور مہربان حضرت ... رضا صاحب کی حیات میں ان کی خدمت میں انتساب کرنا چاہتا تھا لیکن خدا جانے مصلحت ایزدی کیا ہے۔ بہر حال اب یہ کتاب ان کی روح پر نور کی نذر کی جا رہی ہے۔

میں اس کتاب کے بارے میں آپ کی رائے کا منتظر رہوں گا۔

سید وحید الحسن ہاشمی

۲۵۳۔ ایف رحمان پورہ لاہور

یکم جنوری ۲۰۰۲ء

فون: ۷۵۸۰۶۴۳

خطوط نگاری کا فن اور سیّد آلِ رضا

خطوط نویسی کے مدارج

خطوط کے متنوع روپ

آل رضا کے خطوط کے محاسن

maablib.org

ابھی تک لسانیات کے محققین یہ فیصلہ نہ کر پائے کہ دنیا میں خطوط نگاری کی ابتدا کب اور کس دیس میں ہوئی؟ وہ تو دور کی بات ہے یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ اردو زبان میں کس نے اور کب خطوط نگاری کی ابتدا کی؟ یہ امر تو بہر حال طے ہے کہ حضرت آدم اور ان کی اولاد کسی نہ کسی زبان میں بات چیت کرتے تھے اور چونکہ ان کا مستقر ایک ہی تھا۔ اس لئے خط لکھنے کی نوبت ہی نہ آئی مگر جب آبادی بڑھی اور لوگوں کی رہائش میں فاصلے قائم ہو گئے تو خیالات کے ابلاغ کے لئے خطوط ضرور لکھے گئے ہوں گے۔ چینی رسم الخط دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حروف کی عدم موجودگی میں لوگ تصاویر کے ذریعے اپنا مافی الضمیر ادا کرتے تھے۔ غذائی اشیاء، نباتات' حیوانات' برف' پانی اور گھریلو ضروریات کی شکلیں تو ہاتھ سے بنائی جا سکتی تھیں مگر جذبات اور خیالات کی عکاسی حروف کے بغیر ناممکن تھی دوسری زبانوں کے حروف تہجی کے بارے میں تو میرے پاس کوئی مواد نہیں البتہ عربی حروف کے متعلق ماہرین لسانیات نے یہ بتایا ہے کہ الف زنگل ب بیت اور ج جمل کی شکلوں کی نمائندگی کرتے ہیں اسی طرح یا تک کسی نہ کسی مرئی شے کی تصاویر ہیں۔ جب خاندان والوں نے دور کی بستیاں بسا لیں تو خطوط نویسی کا مرحلہ شروع ہوا۔ شکلوں کے بجے ہوئے حروف الگ لکھ کر ارسال کئے گئے۔ مصادر اور ماضی حال مستقبل کے لئے کون کون سی نشانیاں وضع کی گئیں معلوم نہ ہو سکیں کاغذ تو ایجاد نہ ہوا تھا بس درختوں کے پتے ان کی چھال اور جانوروں کی کھالیں مسطر کا کام دینے لگیں۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ عربی کی ابجد انگریزی کی A B C D عربی کا کلمن انگریزی کے K L M N عربی کا قرشت انگریزی کے Q R S T سے کس قدر مشابہ ہیں۔ اسی طرح اردو کے حروف علت (ا و ی) انگریزی کے VOWEL ...... AEIOU اور ہندی کے اَ آ اِ اِی اے اُو اَو آپس میں ہم آواز ہیں۔

ان مثالوں سے محسوس ہوتا ہے کہ کسی دور میں پوری دنیا کی ایک ہی زبان تھی جغرافیائی اثرات کے

باعث آوازوں اور لہجوں میں فرق آ گیا۔

تاریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں اہل یونان، اہل روم اور اہل مصر اپنی اپنی زبانوں میں خطوط لکھا کرتے تھے۔ اسلامی تاریخ میں حضرت یوسفؑ کے خطوط بڑی شدومد سے ذکر کیا گیا ہے تفصیل کے لئے درج ذیل سطور ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت یعقوبؑ کا امتحان خدا نے نامہ و پیام مسدود کر کے لیا تھا جب حضرت یوسفؑ سلطنت حاصل کرنے کے بعد جناب یعقوبؑ کی خدمت میں آئے اور جناب یعقوبؑ نے خط نہ لکھنے کا شکوہ کیا تو یوسفؑ باپ کا ہاتھ پکڑ کے اس مکان میں لائے جہاں خطوط کے صندوق رکھے ہوئے تھے اور ہر خط پر لکھا ہوا تھا (من یوسفؑ الی یعقوبؑ ابیہٖ یہ خط یوسف کی طرف سے ان کے باپ یعقوبؑ کی خدمت میں ہے) جناب یعقوبؑ کو اور زیادہ تعجب ہوا اور پوچھا کہ اتنی کثرت سے لکھنے کے بعد روانہ کیوں نہ کئے حضرت یوسفؑ نے جواب دیا کہ جب میں ارادہ کرتا تھا کہ خط روانہ کروں جبرئیل امینؑ نازل ہو کر مجھے روک دیتے تھے۔ (احسن القصص ص ۵۶۷)۔

یہ خطوط خدا نے اس لئے رکوادئے تاکہ اولاد سے نامہ و پیام کی وجہ سے حضرت یعقوبؑ کے امتحان میں ایک مصیبت کم ہو جاتی۔

جب پیغمبر اسلامؐ مکے سے ہجرت کر کے مدینے آئے تو آپ نے کئی ریاستوں کو خطوط روانہ کئے ان میں سے چند خطوط جامعہ ازہر مصر کی لائبریری میں موجود ہیں۔ حضورؐ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کے دور حکومت میں دارالانشا قائم ہوا مرکزی حکومت صوبائی گورنروں کو خطو ارسال کرتی تھی اور صوبے داران خطوط کے جوابات دینے کے پابند تھے۔ حضرت علیؑ نے و بصرہ عثمان ابن حنیف کو جو خط تحریر کیا ہے ذرا اس کے مقصد پر بھی ایک نظر کر لیں۔

مجھے امید نہ تھی کہ تم ان لوگوں کی دعوت قبول کرو گے جن کے یہاں فقیر و نادار دھتکارے گئے ہوں اور دولت مند لوگ مدعو ہوں جو لقمے چباتے ہو انھیں دیکھ لیا کرو۔ (سیرت علی ج ۲)

اسی طرح آپ نے آذر بائیجان اور اصطخر کے حکام کو تنبیہی خطوط لکھے۔ اسی طرح بنی امیہ بنی عباس اور سلطنت عثمانیہ کے درباروں سے خطوط کی ترسیل ہوتی رہی۔ برصغیر پاک و ہند میں چونکہ فارسی زبان کا غلبہ تھا اس لئے شاہ جہاں کے دور تک کسی اہم ادیب یا شاعر کا کوئی اردو خط دستیاب نہیں ہو سکا۔

اردو کی ابتدا کے بارے میں اس وقت تک چار نظریے پیش کئے گئے ہیں حافظ شیرانی کا خیال ہے کہ مسلمان درۂ خیبر کے راستے پشاور اور پھر پنجاب میں آ بسے اور ملکی لوگوں کے میل جول سے ایک نئی زبان پیدا کرنے کا سبب بنے اور چونکہ اردو اور پنجابی زبان میں بہت زیادہ مماثلت ہے اس لئے اردو پنجاب میں پیدا ہوئی۔ سلیمان ندوی نے اس نظریے کی یہ کہہ کر تردید کی کہ مسلمان تو ۳۹ ہجری سے سندھ میں آنے لگے تھے اس لئے سندھیوں کے میل جول سے جو زبان وجود میں آئی وہی اردو ہے۔ نصیر الدین ہاشمی کا خیال ہے مسلمان ساحل مالابار کے ذریعے قدیم زمانے سے تجارت کرتے تھے اس لئے دکنی افراد کے میل جول سے دکن حیدر آباد میں جو نئی زبان پیدا ہوئی وہ اردو ہے۔ ڈاکٹر محمود حسین (علی گڑھ) نے مندرجہ بالا تینوں نظریات کو رد کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان سندھ اور ملتان سے ہوتے ہوئے دہلی کی جانب آئے اور میرٹھ تا مراد آباد میں مقامی لوگوں سے ملے بھاشا زبان کے اشتراک سے کھڑی بولی پیدا ہوئی یہی اردو کی اصل ہے۔

میں اس منزل پر اردو زبان کی ابتدا کے مسئلے میں الجھنا نہیں چاہتا اس امر سے ہر محقق کو اتفاق ہے کہ مسلمان خواہ عربی یا فارسی بولنے والے تھے برصغیر کی حدود میں داخل ہوئے یہیں بس گئے یہیں انھوں نے اسلام پھیلایا یہیں کے لوگوں میں گھل مل گئے اور یہیں کی مقامی بولیوں کے

اشتراک سے اردو زبان پیدا ہوئی۔ اس بات پر بھی تمام نقادوں کا اتفاق ہے کہ گولکنڈہ کا حکمران قلی قطب شاہ اکبری اور جہانگیری دور میں ۱۶۱۱ء تک شعر و شاعری کرتا رہا اور اردو زبان کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔ جب اردو زبان میں غزلیں سلام اور مرثیے کہے جا رہے تھے تو کیا اس دور میں اردو میں خطوط نہ لکھے گئے ہونگے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سامنے اس دور کے خطوط محفوظ نہیں ورنہ معلوم ہو جاتا کہ اردو زبان کے ادبی اور نجی خطوط کس ڈھب کے ہوتے تھے عام تاثر یہ ہے کہ علمی اور ادبی خطوط فارسی میں اور نجی خطوط اردو میں لکھے جاتے تھے۔

تحسین کی ''نوطرز مرصع'' اور رجب علی سرور کی ''فسانۂ عجائب'' دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل اردو پر عربی اور فارسی الفاظ اور تراکیب کا گہرا اثر ہے مگر جب ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا اور جان گلکرسٹ اس کے منتظم ہوئے تو انھوں نے ''باغ و بہار'' کے مترجم میر امن کو ہدایت کی کہ ایسی کتاب لکھی جائے یا ترجمہ کی جائے جو صاف سلیس اور ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں ہو جسے عام مرد عورت اور لڑکے بالے سب سمجھ سکیں جب باغ و بہار اردو کی ادبی کتاب تسلیم کر لی گئی ہے تو کیا اس طرز کے خطوط عالم وجود میں نہ آئے ہونگے۔

۱۸۲۲ء میں جام جہاں نما اخبار نکلتے سے اور ۱۸۰۰ء میں ''دہلی اخبار'' اور ''سیدالاخبار'' دہلی سے نکلے کیا ان اخباروں کے مدیروں نے مقالہ اور مضمون نگاروں کو ادبی خطوط تحریر نہ کیے ہونگے۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ ''یادگار غالب'' میں مولانا حالی نے غالب کو نرالا خطوط نگار بتایا اور یہ حتمی فیصلہ سنا دیا کہ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا نہ ان کے بعد کسی سے اس کی پوری تقلید ہو سکی۔ مولانا حالی کے اس بیان میں جو لفظ رنگ استعمال ہوا ہے وہ سو فی صد درست ہے مگر طرز جدید کا شعور تو غالب سے قبل بہت سے ادیبوں میں بیدار ہو چکا تھا معروف محقق خلیق انجم نے اسی لفظ رنگ کو استعمال کرتے ہوئے کہا ہے۔

غالب نہ اردو نثر کے موجد ہیں نہ اردو مکتوب نگاری کے باوا آدم لیکن ان

کے خطوط اردو مکتوب نگاری کا بیش قیمت سرمایہ ہیں کیونکہ غالب کے جدت پسند ذہن نے اس فن کو نیا آب ورنگ دیا ہے۔ (غالب کے خطوط ج ا ص ۱۱۱)۔

خطوط نگاری کا فن بھی عجیب فن ہے اب تو اسے بھی فنون لطیفہ میں شمار کیا جاتا ہے اس فن میں فقط دو ہی فنکار شریک ہوتے ہیں اول مکتوب نگار ہے جو اپنے جذبات اور احساسات دل ودماغ سے نکال کر کاغذ پر پیش کرتا ہے خط لکھنے والا یا تو اپنے مسرت آگیں لمحات کی تصویر کشی کرتا ہے یا غم واندوہ، رنج وغم، درد والم اور تکلیفات دلی کا اظہار کرتا ہے جب اپنے غم کا افسانہ دو بدو کسی سے بیان نہیں کیا جا سکتا تو خط ہی موزوں ترین ذریعہ ہے دل کی چوٹ کا حال اور درد جگر کی کیفیت کھل کر خط میں بیان کر کے جی کو ہلکا کیا جا سکتا ہے۔ دوم مکتوب الیہ ہے جس کی شخصیت سے خطوط نگاری واقف ہے اگر مکتوب الیہ اس کا محبوب ہے اور گفتگو رازدارانہ ہے تو ضروری ہے کہ الفاظ شگفتہ اور باوقار ہوں۔ رکیک اور سفلہ جملے ایک طرف تو مکتوب الیہ کے دل و دماغ کو متعفن کر دیں گے دوسری طرف خطوط کی اشاعت کے بعد مکتوب نگار کی خود اپنی شخصیت بھی داغدار ہو جائے گی۔ مولانا شبلی نے عطیہ کو جو خطوط تحریر کئے ہیں انھیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخص سیرت النبیؐ اور الفاروق کا مصنف نہیں بلکہ ایک بازاری اور گھٹیا درجے کا آدمی ہے، جس کے سینے میں دل تو ہے مگر فہم وادراک سے کورا ہے۔ اگر مولانا ذرا بھی مہذب انداز اختیار کرتے تو ڈاکٹر وحید قریشی کی کتاب ''شبلی کی حیات معاشقہ'' شائع نہ ہوتی۔

جگر مرادآبادی مرحوم کے کچھ خطوط ضلع راولپنڈی سے شائع ہو گئے ہیں ان میں دو قسم کے خطوط ہیں کچھ خطوط اس دور کے ہیں جب مرحوم کو شراب نوشی کا شوق تھا۔ دوسری قسم کے وہ خطوط ہیں جو اس دور میں لکھے گئے جب وہ مسلمان سے باقاعدہ مومن ہو گئے تھے۔ پیرائیہ بیان اگرچہ دونوں قسم کے خطوط کا ایک جیسا ہے مگر لفظوں کا استعمال اور جملوں کی ساخت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خط کے بطن کا مفہوم کیا ہے یہی طریقہ، مکتوب نگاری دلچسپ اور دلنشین ہے۔

معاشرے میں کیا نہیں ہوتا پندو نصائح کی محفلیں بھی ہوتی ہیں اور چوری چکاری کے واقعات بھی یہی ہماری روح کو معاشرے سے بیزار کردیتے ہیں مسالئے مقاصدے اور مشاعرے دلوں کو انبساط بخشتے ہیں تو کرپشن رشوت اور بے جا مہنگائی سے گھریلو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے ننھے ننھے بچوں اور بچیوں کا اغوا اور تاوان کی رقوم کی طلب سے اس ماں کے دل پر کیا گزرتی ہے اس کا اندازہ ہم نہیں ایک ماں ہی کرسکتی ہے۔ معاشرتی مسائل پر جو خطوط افسران بالا یا مدیران جرائد کو لکھے جاتے ہیں تو ان میں سوقیانہ باغیانہ عامیانہ غیر شریفانہ اور لچر قسم کے الفاظ نہ ہوں ورنہ عبارتیں برہنہ شمشیر اور اندھے کے تیر کی مانند ہوتی ہیں کبھی کبھی وہ مصنف ہی کا گلا کاٹ کر رکھ دیتی ہیں اس لئے معاشرتی مسائل پر مبنی خطوط نرم اور ملتجیانہ ہوں تاکہ زود اثری اپنا کام کرجائے۔

کسی اہم اور بڑے شاعر و ادیب کو جو خطوط لکھے جاتے ہیں ان میں ٹھہراؤ اور تحمل ہوتا ہے ایسے خطوط بڑے غور و خوض کے بعد لکھے جاتے ہیں یہاں تک کہ الفاظ ناپ تول کر استعمال ہوتے ہیں اس کے مقابل جو تجارتی یا فوری نوعیت کے خطوط ہوتے ہیں وہ قلم برداشتہ تحریر کیے جاتے ہیں ایسے خطوط وقتی اور ہنگامی نوعیت کے ہوتے ہیں جو نہ دیرپا ہوتے ہیں نہ ان کی ادب اور فن میں کوئی قدر و قیمت ہوتی ہے۔

حالات کے پیش نظر اپنے چاہنے والوں کو بھی کبھی طویل کبھی مختصر خطوط تحریر کیے جاتے ہیں طویل خطوط میں یا تو شدید قسم کے مسائل ہوتے ہیں جن سے نکلنے کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے یا دور بیٹھے ہوئے اور تنہائی کے مارے ہوئے افراد اپنی کارگزاری کی تفصیل اور اپنے کارناموں کا ذکر کرتے ہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص اپنے والدین اور اپنے بھائی بہنوں سے جدا ہو کر دوسرے ملک میں چلا جاتا ہے تو وطن اور گھر کی یاد اسے طویل خط لکھنے پر مجبور کردیتی ہے۔ اس قسم کے خطوط میں ایسا مواد ہونا چاہئے جو مکتوب نگار کی قلبی کیفیت کو نہ صرف ظاہر کرے بلکہ ہر دور کا انسان اسے پڑھ کر یہ محسوس کرے کہ وطن کی محبت اور اپنوں کی چاہت کتنی لازوال شے ہوتی ہے۔

اس کے برعکس ایک دوسطروں کا مختصر خط کبھی کبھی بے جان کو جاندار اور مایوس کو پُر امید کر دیتا ہے۔

پچاس سال قبل اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے میں اپنے ضلع سے دوسرے ضلع میں چلا گیا ایک ہی ماہ کے بعد وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی اور میں بیماری سے نبرد آزما ہونے کے باوجود ہمت ہارنے لگا۔ میں نے اپنے والد کو ایک طویل خط تحریر کیا جس میں تمام مصائب بیان کرنے کے بعد لکھا کہ ابا جان اب مجھ پر کڑا وقت آ گیا ہے۔ میرے لئے دعا فرمایئے والد محترم نے مجھے دوسطروں کا خط لکھا جسے پڑھ کر میں ان کے آنے سے قبل ہی بہتر ہو گیا والد محترم کا درج ذیل خط ملاحظہ فرمائیں۔

عزیزی دعا۔ تمہارا خط مل گیا گھبراؤ نہیں میں آ رہا ہوں یاد رکھو ہم وقت کے غلام نہیں بلکہ وقت ہمارا غلام ہے۔ دعا گو شبیر حسن عفی عنہ۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا میرے کڑے وقت کا کس حوصلے کس جرأت اور کس مستقل مزاجی سے جواب دیا ہے مختصر خطوط کو صرف مختصر ہی نہیں بلکہ پُر تاثیر، پُر عزم، پُر حوصلہ، پُر شکوہ اور پُر رفعت ہونا چاہئے تاکہ تھوڑے الفاظ میں بہت اور کم وقت میں زیادہ فائدہ ہو۔

تنقیدی نقطۂ نظر سے جو خطوط لکھے جاتے ہیں ان میں اعتدال کا پہلو نمایاں ہونا چاہئے اگر کسی شاعر کے شعر میں کوئی نقص ہے تو مکتوب الیہ کو نہایت شفقت اور مہربانی سے مثالیں دے کر عیوب کی طرف توجہ دلانا چاہئے کوشش کرنی چاہئے کہ شاعر نقاد کو اپنا ہمدرد اور پُر خلوص دوست سمجھے یہ منزل اسی وقت سر ہو سکتی ہے جب مکتوب نگار میٹھے اور دلکش الفاظ استعمال کرے گا۔ خط میں کوئی لفظ ایسا استعمال نہ ہو جس سے مکتوب الیہ کی خودداری اور انا مجروح ہوتی ہو۔ شیریں اور محبت آمیز الفاظ غیظ و غضب اور ذہنی جھلاہٹ کو پُر سکون اور معتدل کر دیتے ہیں پروفیسر احتشام حسین فراق گورکھپوری کے سلسلۂ مضامین سے نالاں ہیں اور وہ ان مضامین کو اچھا نہیں سمجھتے دیکھئے ۱۹۶۸ء میں وہ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نام اپنے خط میں کس قدر نرمی شستگی اور عام بول چال میں

معلومات بھی فراہم کرتے ہیں اور تنقید بھی کرتے ہیں۔

فراق صاحب نے جتنے مضامین بھی لکھے وہ سب اس تنازعہ کے سلسلہ میں لکھے گئے کہ کھڑی بولی کا وہ کیا روپ ہو سکتا ہے جو ہندوستان میں چل سکے گا۔ اس میں انھیں اردو زیادہ مفید معلوم ہوتی ہے لیکن وہ سنسکرت کے بہت سے نامانوس الفاظ لینے پر بھی زور دیتے ہیں تاکہ اردو کا مزاج ہندوستانی ہو جائے۔ (خطوط سید احتشام حسین ص ۱۷۲)۔

خطوط میں مذہبی نقطۂ نظر سے بھی تنقید کی جاتی ہے مگر خیال رہے کہ مکتوب نگار تنقید کرتے ہوئے خود تعصب کا شکار نہ ہو جائے اس کے علاوہ اس کی تحریر سے نفرت کی بو نہ آنی چاہئے بلکہ ایسے سلجھے ہوئے انداز سے تنقید ہو کہ مکتوب الیہ اسکی تحریر میں کوئی معاندانہ پہلو نہ نکال سکے۔

احمد ندیم قاسمی صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۷۶ء تک وہ ترقی پسند تھے ۱۹۷۷ء میں جب جنرل ضیا نے عنان حکومت سنبھالی اور اسلام اسلام کا نعرہ بلند کیا تو پاکستان کے بھی شاعر نعتیں کہنے لگے اسی زمانے میں ندیم صاحب نے کئی نعتیں کہہ کر شائع کرائیں ان کے حریفوں نے ان کی نعت گوئی پر موقع پرستی کا الزام لگا کر ان کا مذاق اڑایا۔ ندیم صاحب نے حریفوں کا منہ بند کرنے کے لئے اپنی ایک قدیم نعت کا حوالہ دیا مگر لوگوں نے ان کے اس استدلال کو تسلیم نہ کیا ۲۰۰۱ء میں رسالہ شام و سحر لاہور کے محرم نمبر میں ندیم صاحب کا ایک سلام شائع ہوا۔ اسے دیکھ کر ڈاکٹر انور سدید نے اسی رسالے کے جون کے شمارے میں مدیر کو خط تحریر کیا جو طنزیہ خط کا بہترین نمونہ ہے خط میں نہ کوئی گستاخانہ لفظ ہے نہ حقارت آمیز جملہ ہے مگر کاٹ دار اسلوب نے مکتوب نگار کے مفہوم اور مقصد کو بڑی صفائی کے ساتھ واضح کر دیا ہے خط نذر قارئین ہے۔

مدیر محترم۔ سلام مسنون!

شام وسحر کا محرم نمبر مل گیا اس پرچے میں احمد ندیم صاحب کے سلام نے بہت متاثر کیا فیض صاحب نے ایک مرتبہ قاسمی صاحب کی نعت نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔''شاعر نے مشق سخن پوری کر لی ہو تو وہ ہر صنفِ سخن میں کلام کر سکتا ہے" ترقی پسندوں کی نعت نگاری سے متعلق بالعموم یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ لینن کو باپ کہنے والے اب مشرف بہ اسلام ہو رہے ہیں تاہم قاسمی صاحب کا سلام پڑھ کر دل گداز ہو گیا اور اسکے ترقی پسند زاویے پس منظر میں چلے گئے کربلا کے جاودانی عناصر قومیت اختیار کر گئے۔(شام وسحر لاہور جون ۲۰۰۱ ص ۳۵)۔

مکتوب نگار کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے اس کے خطوط کے لہجے کو سمجھنا ضروری ہے۔ لہجہ درحقیقت حسب موقع ومحل بات کرنا ہے۔ جس کی بے شمار خرد آزما صورتیں ہیں۔ عام بول چال بھی لہجے ہی کی ایک دل پذیر صورت ہے چونکہ بول چال کے کئی رنگ اور کئی ڈھنگ ہوتے ہیں مثلاً نرمی اور شائستگی جس سے دلوں کو موہ لیا جاتا ہے یا تندی اور تیزی جس سے پانی پت کے میدان کا منظر سامنے آجاتا ہے خطوط کے لہجے میں بھی یہ دونوں خصوصیات پائی جاتی ہیں لہجہ دھیما ہو یا کرخت اسکی گرفت زمان ومکان پر ہوتی ہے بلکہ لہجے کو اگر زمان ومکان کہہ دیا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں۔ اس وقت میرے سامنے مرزا غالب' مولوی عبدالحق' جگر مراد آبادی اور سید آل رضا کے خطوط ہیں یہ سب کے سب دھیمے لہجے سے پُر ہیں۔ سوز وگداز اور درد وغم کے لہجے کو دھیما لہجہ کہنا کم فہمی کی دلیل ہے۔ دھیما لہجہ تو یقین کامل اور پُر اعتمادی کا لہجہ ہوتا ہے مندرجہ بالا چاروں مکتوب نگار ساری زندگی پریشانیوں اور ذہنی تکالیف کا شکار رہے مگر ان کی تحریروں کے لہجے میں استقامت ثابت قدمی اور غیر متزلزل رویہ صاف نظر آتا ہے۔ ان کے برعکس یگانہ کے چند خطوط میری نظر سے گزرے ہیں جن کے لہجے میں تندی اور تیزی کے علاوہ پھکڑ پن کا رس بھی گھلا ملا ہوا

کھائی دیتا ہے۔ خطوط میں شوخی تو اچھا عنصر ہے مگر گستاخی اور دریدہ دہنی خطوط کی شفاف فضا کو مکدر اور غیر پاکیزہ بنا دیتی ہے۔

اسلوب کی تعریف کرتے ہوئے ایک انگریزی ادیب نے کہا ہے کہ Proper Words In Proper Place اس کا مطلب یہ ہے کہ خطوط نگاری کرتے ہوئے الفاظ کو اس کے بہترین موقعے پر استعمال کرنا چاہئے مثلاً موت والے گھر جا کر یہ کہنا کہ "میں آپ سے ملنے آیا ہوں" درست نہیں ملنے کی جگہ تعزیت کا لفظ استعمال کرنا چاہئے۔ لیکن یہ تعریف اسلوب کے فقط خارجی پہلو کی نشاندہی کرتی ہے جبکہ اسلوب کا تعلق داخلی پہلو یعنی مدعا اور مطلب سے بھی ہے خطوط میں جو لفظ بھی استعمال ہوا سے دیکھ لینا چاہئے کہ وہ مکتوب نگار کے مدعا کی بھی تشریح کر رہا ہے یا نہیں۔

میرے ایک دوست نے یہ جانتے ہوئے کہ میں سرکاری ملازم ہوں مجھے خط میں لکھا کہ "اب آپ کا کاروبار کیسا چل رہا ہے" میں سمجھ گیا کہ وہ میری سروس کے متعلق بات کر رہا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد جب وہ ایم اے اُردو دوست مجھ سے ملا تو میں نے اس سے کاروبار کے لفظ کے متعلق استفسار کیا تو اس نے جواب دیا کہ میرا مقصد سروس ہی تھا اور غالباً آپ نے سمجھ بھی لیا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی لفظ سے ابلاغ معنی ہو جائے تو اس کا استعمال درست ہے۔ میں نے دوستانہ انداز میں اس سے درخواست کی کہ براہ مہربانی مجھے فیض احمد فیض کے درج ذیل مصرع کی تشریح کر کے کاروبار کا مطلب سمجھا دیجئے۔

چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

کئی برس گزر گئے مگر انھوں نے کاروبار کی نہ تشریح کی نہ اس کی بلاغت کے رموز سمجھائے۔

مکتوب نگار کے خط کی تحریر پڑھ کر ہم اس کی پسند و ناپسند شخصیت کے اسرار و رموز سے واقف ہو جاتے ہیں اور چونکہ شخصیت کی تعمیر معاشرے کی محتاج ہے اس لئے مکتوب نگار کو چاہئے

کہ خطوط میں شخصیت' الفاظ' مقاصد اور معاشرے کے حالات پر نظر رکھے۔ یہ چاروں عناصر کبھی ایک ہی خط میں یکجا نظر آتے ہیں کبھی علیحدہ علیحدہ دکھائی دیتے ہیں انہی عناصر سے اسلوب کا تعین ہوتا ہے۔

خطوط میں ماحول کی عکاسی ہوتی ہے تقریباً ہر مکتوب نگار نے اپنے خطوط میں اپنے ماحول کا تفصیلاً یا اجمالاً نقشہ کھینچا ہے۔ غالب نے غدر کے حالات بڑی خوبی سے بیان کئے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے اردو زبان کے مخالفین اور حکومت کی سرد مہری کا دل کھول کر تذکرہ کیا ہے۔ یگانہ نے اہل لکھنؤ کے مذاق شعری پر صدائے احتجاج بلند کی ہے اور ان کے نازیبا کردار پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ جگر مراد آبادی نے مشاعروں کی افادیت اور بانیان مشاعرہ کے اخلاق کی بے حد تعریف کی ہے۔ سید آل رضا نے جدید مرثیے کی تبلیغ میں شدید قسم کی پریشانیوں کا حال تحریر کیا ہے انہی خطوط کی مدد سے ہم ان ادوار کے ماحول کا بہ خوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔

بہت سے مکتوب نگار ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے اپنے خطوط میں اپنے خاندانی حالات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے تاریخ ان کے ناموں اور ان کے کاموں کو محو کر چکی تھی مگر خطوط نے انھیں زندۂ جاوید بنا دیا۔ اگر خطوط نہ ہوتے تو ہمیں کس طرح علم ہوتا کہ غالب کس تاریخ کو پیدا ہوئے کس سن میں شادی ہوئی کتنے بچے پیدا ہوئے پنشن کے لئے کہاں کہاں مارے مارے پھرے کلکتے میں کن لوگوں نے ان کا استقبال کیا اور کن اصحاب نے ان کی تحریروں پر اعتراضات کئے۔ یہ خطوط ہی کا فیض ہے کہ ہمیں بہت سے گمنام لوگوں کے نام بھی یاد رہ گئے ہیں۔

منظوم کلام میں قافیہ ردیف اور وزن کی قید ہوتی ہے اس پابندی کو برقرار رکھنے کے لئے فکر و عمل کا تر و تازہ ہونا ضروری ہے مگر جب قویٰ مضمحل ہو جائیں تو مشقت کا بار اٹھانا قدرے دشوار ہو جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اچھی اور بڑی شاعری بیس سے ساٹھ سال تک کے اندر اندر ہوتی ہے۔ کیوں کہ مضامین کی تلاش میں سیروں خون جگر صرف کرنا پڑتا ہے تب ایک مصرع ترکی

صورت نظر آتی ہے اس کے برعکس خطوط نگاری میں ایسی کوئی پابندی نہیں۔ جوانی کے ایام میں جو خطوط لکھے جاتے ہیں ان میں تیزی طرّاری اور شوخی ہوتی ہے مگر بڑھاپے میں ذہنی کاوش ساتھ نہیں دیتی اس لئے خطوط بھی سادہ صاف اور مختصر ہوتے ہیں اسی لئے کہا گیا ہے کہ نجم الدولہ اور غالب کے خطوط میں بین فرق ہے اگر مسجع مقفیٰ شوخیانہ اور باغیانہ عبارت کا شوق ہو تو جوانی میں لکھے ہوئے خطوط پڑھ لیں لیکن اگر تجربات کی مٹھاس اور دیدہ وری کی خوشبو کی احتیاج ہو تو سن رسیدگی کے دور کے خطوط کا مطالعہ کریں۔ بڑھاپے میں رومانتک خطوط کا تصور ہی محال ہے اس دور میں تو پند و نصیحت اور زمانہ ماضی کے واقعات کی جھلکیاں ہی نظر آئینگی۔ مولوی عبدالحق کے خطوط ہوں یا پروفیسر احتشام کے دونوں میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ شادی جلد کرلیں ورنہ قباحتوں اور جھنجھلاہٹ میں گرفتار رہینگے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تحقیق کے مطابق سید آل رضا ۱۰۔ جون ۱۸۹۶ء کو ضلع اناؤ (لکھنؤ) میں پیدا ہوئے اور دوسری مارچ ۱۹۷۸ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ مرحوم علامہ آرزو لکھنوی کے شاگرد رشید تھے ان کی غزلوں کا پہلا دیوان نوائے رضا کے نام سے ۱۹۲۹ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا دوسرا دیوان غزل معلّٰی کے نام سے ۱۹۵۹ء میں کراچی سے شائع ہوا۔

۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۸ء تک تیس سال میں مرحوم نے مجھے سو سے زائد خطوط لکھے لیکن کراچی سے لاہور منتقل ہونے اور لاہور میں کئی مکان تبدیل کرنے کی وجہ سے میں ان کے تمام خطوط محفوظ نہ رکھ سکا۔ شروع شروع میں وہ پوسٹ کارڈ پر خطوط ارسال کرتے رہے جن میں خیریت کے علاوہ کوئی فنی یا ادبی نکتہ درج نہ ہوتا تھا لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد انہوں نے جو خطوط لکھے ہیں ان میں نہ صرف ادبی چاشنی بلکہ کئی شاعرانہ رموز پوشیدہ ہیں۔

سید آل رضا کے تمام خطوط کا انداز یکساں ہے۔ ہر خط سادگی اور بے تکلفی کا نمونہ معلوم ہوتا ہے صنائع بدائع تشبیہات واستعارات نام کو نہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملے دل میں اتر کر روح کو

مسخر کر لیتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرکب جملے ان کی فطرت کے خلاف ہیں۔ بازاری زبان اور حشو و زوائد سے پرہیز ہے جو خیال ذہن میں آتا ہے وہی کاغذ پر اترا ہوا معلوم ہوتا ہے مثلاً ۱۹۶۴ء کے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں۔

''میں نے غزل کہنا چھوڑ دیا ہے اور محفلوں کی شرکت بھی نہ ہونے کے برابر ہے کیا کروں رنگ زمانہ نے مجبور کر دیا اب اگر کوئی ٹیڈی قسم کی پوشاک زیب تن نہ کرنا چاہے تو بہتر ہے کہ حتی الوسع گوشہ نشینی ہی اختیار کر لے رنگ زمانہ میری خاطر سے کیوں بدلے اور میں اس کے خلاف کوئی اور توقع ہی کیوں کروں''۔

۱۹۶۷ء کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

''ڈاکٹر عابدی صاحب کی تحریر کا مرسلہ اقتباس میرے لئے بہت طمانیت بخش ہے اور حضرات کے رشحات قلم بھی جو مجھ تک آپ کے ذریعے پہنچے ہیں بڑے محبت افزا اور مستحق تشکر ہیں آپ نے تو اس بارے میں نہ معلوم کیا کیا جمع کر لیا ہے اگر یہ کچھ بھی نہ ہوتا تب بھی آپ جس انہماک اور خلوص کے ساتھ مرثیے کی طباعت پر توجہ کر رہے ہیں میرے لئے باعث منت ہوتا جزاکم اللہ''۔

انسان جذبات اور خیالات کا مرقع ہے جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو غمزدہ ہو کر اس کا اظہار اپنے خطوط میں کرتا ہے اور جب مسرت کے لمحات میسر آتے ہیں تو خوشی کا اظہار کرتا ہے سید آل رضا بھی ایک جیتے جاگتے انسان تھے ان کے قلب میں تمام بنی نوع انسان کی بھلائی کا خیال موجزن رہتا تھا جس طرح اپنے عزیزوں کی بیماری اور موت پر وہ آنسو بہاتے تھے اسی طرح دوسروں کے مصائب پر بھی وہ تڑپ جاتے تھے اس سلسلے میں ان کے خطوط سے چند

اقتباسات نذر قارئین کئے جاتے ہیں۔

یکم دسمبر ۱۹۶۸ء میں میری والدہ کا انتقال ہو گیا میں نے مرحوم کو اس سانحہ عظیم کی اطلاع دی اسکے جواب میں مجھے تحریر فرماتے ہیں۔

(ا)۔ "۳۔ دسمبر کا کوئی خط مجھے نہیں ملا ورنہ ممکن نہ تھا کہ مجھے آپ کی والدہ مرحومہ کے سانحۂ ارتحال کی اطلاع ملتی اور میں فرض تعزیت ادا نہ کرتا خدا مرحومہ کو غریق رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے ماں ماں ہے کسی عمر میں اس کا سایا اٹھ جانا ایک بڑی نعمت سے محروم ہو جانا ہے مگر آپ یہ بھی تو چاہ نہیں سکتے تھے کہ وہ آپ کو چھوڑ کر سفر آخرت اختیار نہ کریں"۔ (خط ۱۳۔ جنوری ۱۹۶۹ء)۔

(ب)۔ اسی سال مرحوم کے جواں سال بیٹے سید قمر رضا کا بھی انتقال ہو گیا قمر مرحوم چند سال لاہور کے ایس پی بھی رہ چکے تھے میرے تعزیتی خط کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس سخت امتحان کے وقت خدا کے فضل اور سرکار حسینیؑ کی مدد نے مجھے ایسا سنبھالا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ واہ رے کریم ساز کی رحمت اور اپنے کربلا والوں کا دیا ہوا سبق کہ برابر یہ محسوس ہو رہا ہے کہ کوئی بڑی محبت سے مجھے کلیجے سے لگا رہا ہے ایک خاص کیفیت میں یہ شعر تو کہا..................

شام سے یوں تو رہا وقت اندھیرے کا مگر
اب ہوئی رات تو اب چاند مرا ڈوب گیا

لیکن پھر زبان سے یہ بھی نکلا۔

غم حسینؑ ہے سب کچھ غم قمر کیا ہے

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور جزائے خیر دے"۔ (خط ۱۳۔ جنوری ۱۹۶۹ء)

سید آل رضا شاعر تھے عروضی نہ تھے انھوں نے مجھ سے کئی بار کہا کہ لاہور میں عابد علی

عابد صاحب موجود ہیں عروض کے سلسلے میں ان سے مشورہ کر لیا کرو میں نے جب ان کے اپنے فن کے بارے میں دریافت کیا تو یہ جواب دیا۔

(الف)۔ ''میری شاعری نموداری کی خواہش سے بالکل بے تعلق ہے باوجودیکہ اظہار مطلب کے وقت اپنی حد تک تمام شاعرانہ صلاحیتوں کو کام میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نے بلحاظ موضوع نیز بہ لحاظ زبان و قواعد عروض اپنے اوپر سخت پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ آخر الذکر کا لحاظ جتنا غزل میں کرتا ہوں اتنا ہی مرثیے میں بھی''۔ (خط ۱۲۔ مارچ ۱۹۶۴)۔

(ب)۔ میں نے ذکر فاطمہؑ اور ذکر مرتضیٰؑ کو ایک نظم میں ہم قافیہ استعمال کیا تھا اس کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

''اپنی احتیاط کے لحاظ سے ایک امر کی جانب اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں ذکر فاطمہ میں فارسی ترکیب استعمال ہونے کی وجہ سے الف نہیں پڑھی جائے گی لہذا مرتضیٰ کا ہم قافیہ نہ ہو سکے گی یہ استعمال صرف اردو میں جائز ہے''۔ (۸۔ جنوری ۱۹۶۸)۔

(ج)۔ میں نے ہدیہ اور فدیہ کے بارے میں تحریر کیا تھا کہ کیا یہ دونوں الفاظ ہم قافیہ ہیں اس کے جواب میں تحریر کرتے ہیں۔

''آپ نے جو ہدیہ کے متعلق لکھا ہے مجھے اس میں شک ہے لکھنؤ میں میں نے اس لفظ کو کسی سے نہیں سنا ایک لفظ اور ہے کسر کے ساتھ ہدیہ یائے تحتانی کی تشدید کے ساتھ مگر اس کے معنی اور ہیں یعنی کار جہت نیسرت نہ کہ تحفہ یا منا میں جانور کی قربانی اس کے لئے ہدیہ یا یدیہ استعمال ہوتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہدیہ اور فدیہ ہم قافیہ نہیں ہیں۔ یہاں روی ہے ہدیہ کی ی اور ماقبل دال اور مذکر روی متحرک ہے جس کے پہلے حرف کی حرکت قابل لحاظ نہیں مثلاً ہدیہ اور خلیہ کیا یہ الفاظ ہم قافیہ نہیں کہے جا سکتے''۔ (خط ۲۲۔ فروری ۱۹۶۸ء)۔

د)۔ نجم آفندی مرحوم نے اپنے ایک قطعہ میں تیسرا اور چوتھا مصرع یوں نظم کیا ہے۔

اے آج کی اشتراکیت پہ نازاں
سلمان کی گورنری و مزدوری دیکھ

میں نے آل رضا مرحوم سے استفسار کیا تھا کہ آپ کے خیال میں کیا چوتھا مصرع درست ہے مرحوم نے جواب دیا۔

"لاہور سے جو رسالہ آتا ہے اس میں نجم صاحب کا وہ قطعہ ضرور شائع ہوتا ہے جس میں موصوف نے گورنری و مزدوری استعمال کیا ہے گورنری کو فارسی کا لفظ سمجھا جائے یہ پروفیسر وزیرالحسن عابدی صاحب سے دریافت کیجئے گا"۔ (خط ۱۲۔ ستمبر ۱۹۶۸ء)۔

(ھ)۔ میں نے مرحوم سے سوال کیا تھا کہ دس محرم درست ہے یا دسویں محرم مرحوم نے درج ذیل جواب تحریر کیا۔

"مہینہ لکھنے کے بعد پانچویں کے بعد سے تاریخ کے بعد یں لگانا ثقات کی زبان پر ہے عوام اس کا لحاظ نہیں کرتے مگر یہ بات محتاط لوگوں کے نزدیک غلط العام کے درجے تک نہیں پہنچی جو اس کو بھی فصیح مان لیا جائے۔ اب رہا مہینہ لکھنے سے پہلے تاریخ لکھنے کا سوال جیسے ۱۰۔ محرم (نہ کہ محرم کی دسویں) سو اس کے بارے میں غالباً مذکورہ عبارت صحیح نہ ہو یعنی ۱۰۔ محرم کہنے کو اگر قاعدے کی رو سے غلط کہا بھی جائے تو کم سے کم غلط العام ضرور ہے جو جائز سمجھ لیا جائے گا"۔ (خط ۱۰۔ ستمبر ۱۹۷۱ء)۔

(ز)۔ میں نے آل رضا مرحوم کو خط لکھا کہ کراچی کے کچھ شعرا دوسروں کے مصرع بیتیں اور بند اپنے کلام میں شامل کر کے عوام کی مجلسوں میں پڑھ رہے ہیں کیا یہ عمل سرقے میں نہیں آتا انھوں نے جواب دیا کہ۔

"محض شاعری یا نقالی میری مرثیہ گوئی سے کوسوں دور ہے نقالی یا اساتذہ کے کلام میں ادھر ادھر سے سرقہ کر کے مرثیہ تیار کر لینا تو میرے لئے حرام ہے۔ رنگ قدیم میں مرثیہ کہنے

والے اب سینہ زوری سے کام لیتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ پرانا کلام کس کو یاد ہے اگر دو تین فی صدی افراد جانتے بھی ہیں تو ان کی شہرت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ زیادہ تر لوگ اپنی لاعلمی میں تعریف کرنے پر آمادہ ملینگے"۔ (خط ۱۹۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء)۔

(ح)۔ میں نے استاد مرحوم کو تحریر کیا کہ لفظ رہائش خود ہی غلط ہے جبکہ لفظ رہائشی اس سے بدتر ہے مگر آپ نے اپنے ایک خط میں یہ لفظ استعمال کیا ہے اسے غلط العام سمجھا جائے مرحوم نے جواب دیا کہ:۔

"اس عرض حال میں ایک جگہ میں نے رہائشی کا لفظ استعمال کیا ہے جو باوجود مستعمل ہونے کے غلط ہے اسے آپ سکونتی بنا لیجئے"۔ (خط ۱۳۔ جنوری ۱۹۶۷ء)۔

(ط)۔ میں نے مرحوم کو ایک سلام اصلاح کے لئے ارسال کیا دانائی' بینائی اور گہرائی جس کے قوافی تھے مطلع میں توانائی اور بینائی استعمال ہوئے ہیں۔ میرے مطلع پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"سلام کے مطلع میں آپ نے توانائی اور بینائی کہہ کر تا کو مقید کر دیا ہے اور پھر اشعار میں اسکی پابندی نہیں کی۔ کسی اور طرح میں کوشش کیجئے"۔ (خط ۱۵۔ اپریل ۲ ۱۹۷ء)۔

سید آل رضا وکیل تھے اور بات دلیل سے کرتے تھے میں ادیب اور نقاد ہوں بات روایت اور درایت سے کرتا ہوں میرا نظریہ ہے کہ جب نفسیاتی مرثیے کہے جائیں تو شہدائے کربلا کے کسی نفسیاتی پہلو پر گفتگو کرنے سے قبل مرثیہ نگار کو خود نفسیات کا عالم ہونا چاہئے آل رضا مرحوم کا یہ نظریہ تھا کہ شاعر کو شاعر ہی ہونا چاہئے وہ بچوں جوانوں اور بوڑھوں کی فطرت سے آگاہ ہو کر ان کی طبعی مناسبتوں کا تذکرہ کرے۔

مختصر مرثیوں کی بحث کا آغاز کرتے ہوئے میں نے تحریر کیا تھا کہ چونکہ مختصر مرثیے چالیس پچاس بند پر مشتمل ہوتے ہیں اس لئے ان میں روایات کی جگہ اشارات اور واقعات کی

جگہ تلمیحات ہوں۔ انا' خودداری' کشمکش' محبت' شخصیت' قومیت' اطاعت' بغاوت' شہرت' احساس اور اسی قسم کے عنوانات پر گفتگو کرتے ہوئے انھیں کربلا کے کسی دردانگیز واقعے سے منسلک کر کے مصائب کے پہلو نکالے جائیں اسی سلسلے میں میں نے یہ جملہ تحریر کیا۔

''کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ فقط ایک چھوٹا مگر اہم واقعہ یا کردار کی ذہنی کیفیت ہی مختصر مرثیے کے لئے بہت ہے۔ سید آل رضا' جوش اور مظہری کے یہاں فکری عنصر مرثیوں کی زینت تو بنے ہیں لیکن نفسیاتی عناصر کم سے کمتر ہوتے چلے گئے ہیں''۔ (پانچ مختصر مرثیے ص 12)۔

استاد مرحوم میرے مندرجہ بالا جملے کی روح سے متفق نہ ہوسکے اور انھوں نے مجھے تحریر کیا۔

''جب آپ کے اس جملے کو پڑھتا ہوں تو اپنے اوپر بڑا افسوس معلوم ہوتا ہے یہ الفاظ پڑھ کر میں نے بجلی کا ایک جھٹکا سا محسوس کیا۔ کیا لاہور کے ہوش مند سامعین نے میری متعدد مجالس سننے کے بعد میرے متعلق یہی رائے قائم کی ہے اگر ایسا ہے تو انھوں نے اپنی گفتگو اور تحریری تبصروں سے مجھے خواہ مخواہ ایک سخت غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا جس کا انکشاف اب ہوا''۔ (خط ۳ ۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء)۔

میں نے ۸۔ اکتوبر کو انھیں تحریر کیا کہ آپ نے میرے جملے کے دو ٹکڑوں یعنی ''اہم واقعہ'' اور ''کسی کردار کی ذہنی کیفیت'' پر غور نہیں کیا جو مختصر مرثیے کے لئے موزوں ہیں میں نے یہ بھی تحریر کیا کہ شعرائے قدیم اور شعرائے جدید نے واقعات کا تو بہت ذکر کیا ہے مگر ذہنی کیفیت کا جائزہ کم لیا ہے۔ میرے خط کے جواب میں مرحوم نے درج ذیل جملے ارسال کئے۔

۱۔ ''آپ کی توضیح نے میرے نزدیک معاملے کو اور الجھا دیا۔

۲۔ وہ نفسیاتی عناصر کیا ہیں جو میرے مرثیوں میں ظاہر لیکن کم سے کم تر ہوتے چلے گئے۔

۳۔ کیا آپ کے سوالنامے میں کہیں اس جانب کوئی اشارہ ہے کہ مختصر مرثیہ اس خصوصیت کا ہونا چاہئے۔

۴۔ جب آپ نے پانچ مختصر مرثیے شائع کئے تو اس کا کوئی ذکر آیا کہ یہ مرثیے اس معیار کو

مطلق پورا نہیں کرتے جو اس تحریک کی بنا ہے۔

۵۔ مجھے اپنی بکی کا خیال نہیں ہے اگر کوئی بات مجھ سے قابل اعتراض سرزد ہوئی تو اس کی نشاندہی میں کیا مضائقہ"۔ (خط ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء)۔

میں نے ۱۴۔ اکتوبر کے خط میں تحریر کیا کہ نفسیاتی عناصر وہی ہیں جو نفسیات کی کتابوں میں درج ہیں مختصر مرثیے کا مطلب بند کی تعداد کی کمی نہیں بلکہ اس کا مقصد ذہن کی گتھیوں کو اس طرح سلجھانا ہے کہ مرثیے میں مرثیت قائم رہے سوز خوانی کے مرثیے رقت تو پیدا کرتے ہیں جس کا تعلق دل سے ہے مگر وہ ذہنی فضا کو منور نہیں کرتے۔ میں نے اس سلسلے میں عظیم قریشی کا ایک نایاب قطعہ (اور بشر سے اب کیا ہوتا) مثال کے طور پر پیش کیا۔

میرے خط کے جواب میں مرحوم نے لکھا کہ:۔

۱۔ آپ مختصر افسانے میں Suspense کو کہیں بہتر اور ضروری سمجھتے ہیں کہیں نامناسب خیال کرتے ہیں۔

۲۔ پروفیسر عابدی اور مولانا مرتضیٰ حسین سے رائے لے لیں۔

۳۔ اگر میں کم بند کا مرثیہ کہتا تو یہ خامی میرے کلام میں پھر بھی پائی جاتی۔

۴۔ کس کے مرض نے جو مجھ پر حملہ کیا ہے ذرا اس کی وضاحت کر دیں۔

۵۔ عظیم قریشی نے ذکر کربلا بھی کیا اور خنداں اور شاداں کے الفاظ بھی استعمال کئے یہ میری سمجھ سے باہر ہے ہوگی یہ خوبی جو اور حضرات کو مبارک ہو۔

میں نے یہ طویل اقتباسات اس لئے پیش کئے ہیں تاکہ قارئین کو اندازہ ہو جائے کہ خطوط میں استدلال کا رنگ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ غالب کے متعلق مشہور ہے کہ انھوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا آل رضا مرحوم کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے مراسلے کو مقالہ بنا دیا۔

سید آل رضا اپنے خطوط کے ذریعے ادیبوں اور شاعروں کی دل کھول کر حوصلہ افزائی

کرتے ہیں یہاں تک کہ اگر ان کا دشمن بھی کوئی اچھا اور نیک عمل کرے تو وہ اس دشمن جاں کی توصیف کر کے اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں مرحوم نے اپنے خطوط میں جا بجا جوش ملیح آبادی' نجم آفندی اور راجہ صاحب محمود آبادی کی تعریف کی میرے کئی اچھے اشعار پر مجھے شاباش دی ہے۔ چند مثالیں نذر قارئین ہیں۔

۱۔ آپ نے چند چلے جانے والوں کے نام گنوائے ہیں اب اس فہرست میں جو بہت بڑی اور مدتوں یاد کئے جانے والے نام کا اضافہ ہوا ہے وہ عزائے شاہ شہیداں کے سلسلے میں بہت یاد آئے گا۔ افسوس کہ نجم آفندی آنجہانی ہو گئے۔
(خط ۳۰۔ دسمبر ۱۹۷۵ء)۔

۲۔ آپ کے (ہاشمی کے) پہلے مرثیے کی خوانندگی کی ایسی قابل قدر مقبولیت میرے لئے بڑی طمانیت خاطر کا سامان لائی اب تو انشاء اللہ آپ اس طرف اور متوجہ ہو نگے۔
(خط ۳۔ جون ۱۹۷۳ء)۔

۳۔ شہود عرفاں کا شکریہ سہیل صاحب (بنارسی) نے اپنے رنگ میں اچھے اشعار کہے ہیں قصیدہ گوئی میں انھیں یدطولیٰ حاصل ہے۔ (خط ۶۔ فروری ۱۹۶۸ء)۔

۴۔ شاہد نقوی صاحب کا لاہور میں پھر مرثیے پڑھنا اور آپ سب کی طمانیت خاطر کی اطلاع موجب طمانیت خاطر ہوئی۔ (خط ۱۰۔ جون ۱۹۷۶ء)۔

۵۔ لاہور سے آئے ہوئے خطوط سے محبت کی خوشبو نکلتی ہے میں آپ سب حضرات کا کس طرح شکریہ ادا کروں اس ضعیفی میں میری یہ امتحانی زندگی جس دور سے گزر رہی ہے اسکی بہترین آماجگاہ لاہور ہے۔ (خط ۱۷۔ فروری ۱۹۶۹ء)۔

یہ سید آل رضا کے کمال حسن تحریر کے چند نمایاں پہلو تھے جن کا ہلکا سا خاکہ میں نے پیش کیا۔ انھوں نے اس مختصر سے مجموعے میں جو کمالات دکھائے ہیں اور معاشرتی نجی اور مذہبی

تصاویر کھینچی ہیں وہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہیں۔ غم واندوہ اور فرحت وانبساط کے لئے جو الفاظ اور جس ترتیب سے بیان کئے ہیں ان میں نہ کہیں سقم ہے نہ حشو وزواید ہے۔ بعض اوقات اپنے مطلب کو تاریخی پرواز دے کر جملوں کو پُر تاثیر کردیا ہے۔ وہ شاعری میں میرے استاد تھے بیخود دہلوی کی طرح ڈانٹ ڈپٹ بھی کرسکتے تھے مگر لکھنوی تہذیب مانع رہی۔ میرے جو اشعار انھیں پسند آئے انھوں نے کھل کر ان کی تعریف کی اور میرا حوصلہ بڑھایا جو اشعار پسند نہ آئے انھیں حذف کرنے کی تلقین کی اور لطف کی یہ بات ہے کہ اپنی ناپسندیدگی کی ۔ حوہ بھی بیان کردیں۔ انھوں نے میرے مختصر مرثیے کی تعریف بھی کی مگر اس کے اشکال کا محاسبہ بھی کیا۔

ان کی تحریروں میں کہیں کہیں مزاح کا رنگ آیا تو ہے مگر آٹے میں نمک کی طرح البتہ طنزیہ انداز زیادہ نمایاں ہے وہ ایک بار ایک نظریہ قائم کرلیتے تھے پھر اس سے سرمو تجاوز نہ کرتے انھوں نے نفسیاتی مرثیے کے بارے میں میری رائے سے مکمل اختلاف کیا آخر کار یہ کہہ کر بحث بند کردی کہ اس مسئلے میں پروفیسر وزیر الحسن کی رائے لے لی جائے۔ مجھ سے انھیں بے پناہ محبت تھی جس کا اظہار وہ اکثر خطوط میں کرتے رہے۔ آج ان کی موت کو پچیس سال ہوگئے ہیں مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ میرے ہر شعر کے اندر سے میرا حوصلہ بڑھا رہے ہیں۔ ایسے استاد اب کہاں......!!!

madblib.org

آلِ رضا کے خطوط کی تدوین

(۲۲ـ اکتوبر ۱۹۳۸ء تا ۴ـ دسمبر ۱۹۷۷ء)

پہلا مکتوب

(۲۲۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

میں نے اگست ۱۹۴۸ء کے آخری ہفتے میں اپنے نوحوں اور سلاموں کا مسودہ تیار کر کے اپنے ہم جماعت حسن عسکری کو جواب حسن عابدی کہے جاتے ہیں دیدیا تھا تاکہ وہ کتاب (الصراط) پر مقدمہ تحریر کر دیں موصوف نے یہ مسودہ مع مقدمہ مجھے ۱۱۔ ستمبر کو صبح ۹ بجے دیدیا جسے لے کر میں کاتب کے پاس چلا گیا اور اسے مناسب ہدایات دے کر اٹھنے لگا تو خبر ملی کہ قائداعظم انتقال کر گئے۔ میں لاحول پڑھتا ہوا ایک ضروری کام سے سندھ مدرسہ چلا گیا۔ وہیں سے پیش امام کے ہمراہ ایوان صدر میں قائداعظم کی نماز جنازہ میں شریک ہو گیا۔

کاتب صاحب نے مسودے کی خود ہی کتابت کی خود ہی پروف پڑھا اور خود ہی کسی پریس سے چھپوا کر ایک ہزار کتاب اکتوبر کے پہلے ہفتے میں میرے گھر پہنچا کر اپنی مطلوبہ رقم لی اور چلے گئے۔

کتاب کی اشاعت کے بعد میں نے سید آل رضا' جناب قمر جلالوی' جناب بدر الہ آبادی' جناب شاہ انصار الہ آبادی' جناب ساحل بلگرامی اور دیگر شعرائے کرام کو ایک ایک نسخہ ارسال کر دیا سوائے سید آل رضا مرحوم کے کسی نے جواب تک نہ دیا۔

سید آل رضا مرحوم کا جواب میرے لئے بڑا فائدہ مند ثابت ہوا۔ موصوف نے ان خامیوں کی نشاندہی کر دی جو میرے کلام میں تھیں اور متبادل مصرع بھی تحریر کر دیئے۔ خدا ان کی قبر کو منور کرے اور انھیں جوار رحمت میں جگہ دے۔ درج ذیل خط بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

"کراچی۔

۲۲۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء

محترمی تسلیم و دعا

آپ کی مطبوعہ کتاب "الصراط" جس میں نوحے اور سلام شائع ہوئے ہیں مجھے ملی۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے شہدائے کربلا کی مودت میں اچھے اشعار کہے ہیں۔ حسینیت کی تبلیغ کا جو جذبہ اکثر اشعار

میں دکھائی دیا قابلِ قدر ہے۔

درج ذیل مصرعوں کے نقائص اور ان کے متبادل مصرع بھی لکھ دیے ہیں۔

صفحہ ۱۳۔ لاشِ کڑیل جواں اٹھائے کون۔

کڑیل ہندی ہے لاش کی اضافت کے ساتھ یہ ترکیب مناسب نہیں "لاشۂ نوجواں اٹھائے کون" کر لیجئے۔

صفحہ ۱۸۔ مقطع میں بھوتا اور سوجھتا قوافی درست نہیں دوسرا مصرع یوں کر لیں۔

"عباس تم سا بھائی اب دوسرا نہیں ہے"۔

صفحہ ۲۳۔ "اے وائے پھرے یوں نہ دردر کھلے سر کوئی"۔ نہ بحر میں نا بن گیا ہے اسے یوں کر لیں۔

"دردر نہ پھرے یوں بھی غمگین کھلے سر کوئی"

نیاز مند

آلِ رضا

دوسرا مکتوب

(۷۔ ستمبر ۱۹۶۲ء)

میں ایک نجی کام کے سلسلے میں آلِ رضا مرحوم کے شاگرد جناب حسن اختر مرحوم پرنسپل حبیب پبلک اسکول کراچی سے ملنے گیا تھا۔ کام تو نہ ہو سکا مگر اعزہ سے ملاقات کا سلسلہ طویل ہو گیا۔ میں نے لاہور ہی سے ایک خط سید آلِ رضا صاحب کو ارسال کر دیا تھا کہ میں کراچی پہنچ کر آپ سے ملاقات کروں گا مگر موقع نہ مل سکا اور ان سے ملاقات نہ ہو سکی اس خط میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جناب عسکری صاحب گلبرگ لاہور میں مقیم تھے اور مرثیے کے بڑے دلدادہ تھے۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین زیدی محکمہ تعلیم پنجاب میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے انھوں نے مرثیے کی اشاعت کے سلسلے میں متعدد مرثیہ نگاروں کے مراثی شائع کیے اور ان پر مقدمات تحریر کیے۔

"کراچی۔

۷۔ ستمبر ۱۹۶۳ء

محبی تسلیم و دعا

محبت نامے کا شکریہ۔ میں آپ کا انتظار ہی کرتا رہ گیا اور آپ پھر لاہور واپس پہنچ گئے آپ کے جانے کے بعد میں پھر تپ لرزہ کے ایک دوسرے حملے کی شدید زد میں آ گیا۔ اور طبیعت بہت بے حال ہو گئی کمزوری کی یہ حالت تھی کہ بولنا بھی ناگوار تھا۔ خیر خدا کا شکر ہے کہ اب بہتر ہوں اور چلنے پھرنے لگا ہوں آخر ستمبر تک انشاء اللہ لاہور جانے اور چند روز قیام کرنے کا ارادہ ہے مگر انسان اپنے ارادے پر کب قادر ہے اللہ مالک ہے پرسوں لکھنؤ کے ایک نواب صاحب جو لاہور میں تجارت کرتے ہیں (نواب عسکری) ہاشم سلمٰ کے یہاں ملے تھے میرا لاہور کا ارادہ معلوم کرنے کے بعد مصر ہوئے کہ ان کے گھر پر ایک مخصوص اور منتخب مجمع کے سامنے کوئی مرثیہ پیش کروں میں نے ان سے کہہ دیا کہ اس انتخاب میں آپ سے بہت مناسب مدد ملے گی خیر جب وہ وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔ کراچی کے ایک صاحب سے لاہور یا پنڈی میں کہیں صفدر صاحب سے ملاقات ہو گئی ارشاد ہوا کہ ان کے خلاف یہ سب آگ آل رضا کی لگائی ہوئی ہے۔ خیر وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

خدا حافظ خیر طلب۔

آل رضا"

تیسرا مکتوب

(۳۔ مارچ ۱۹۶۴ء)

میں نے اپنی ایک غزل جس کا مطلع درج ذیل ہے استاد محترم کو اصلاح کے لئے بھیجی تھی جسے انھوں نے اصلاح کے بعد واپس کر دی۔

مطلع :۔......کام آتے کبھی وقت پر دوستو...... یہ تمناری عمر بھر دوستو

"جدید مرثیے کے تین معمار" کے عنوان سے ڈاکٹر ہلال نقوی نے ایک کتابچہ شائع کیا ہے اس کتابچے کے صفحہ ۴۵ پر سید آل رضا مرحوم کا ایک خط شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے اپنے چار شاگردوں کے نام لئے ہیں مگر میرا نام نہیں اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ میں آل رضا مرحوم کا شاگرد نہیں اگر ایک خط سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے تو ان پچاس خطوط سے کیا نتیجہ نکلے گا جس میں مرحوم نے میرے کلام پر اصلاح دی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ یہ کتابچہ دسمبر ۷۷ء میں شائع ہوا لیکن اسکی تقسیم اس دن ہوئی جس دن ۸ ۷ء میں مرحوم کا چہلم تھا۔ تین ماہ تک کتابچے کو تقسیم سے روکنا اور مرنے والے کی موت کا انتظار کرنا بڑا غیر ادبی ہی نہیں غیر انسانی فعل معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ کتابچہ دسمبر میں تقسیم ہو جاتا اور میرے علم میں آ جاتا پھر بھی میں مرحوم سے شکایت نہ کرتا کیونکہ میرے پاس تو دلائل کے انبار موجود ہیں۔

خلیفۂ عباسیہ نے ایک عالم سے پوچھا کہ تم صحابۂ کرام میں سے کسے بہتر سمجھتے ہو اس نے خلیفۂ اول خلیفۂ دوم اور خلیفۂ سوم کے نام لئے خلیفہ نے کہا اور علی؟ عالم نے کہا تو نے اصحاب کا ذکر کیا تھا علی تو نفس رسولؐ ہیں ان کا اصحاب سے کیا تعلق۔ کبھی کبھی نام پوشیدہ رکھ کر بھی زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ خدا سب کو نیک اعمال کی ہدایت دے۔

" کراچی۔

۴۔ مارچ ۱۹۶۴ء

محترمی تسلیم

کل ایک لفافہ آپ کے اسکول کے پتے سے روانہ کر چکا ہوں جس میں آپ کی ایک غزل دوستو والی اور میری غزل راولپنڈی والی ملفوف ہے۔ اس وقت صبح کو معلوم ہوا کہ فضل حسین صاحب لاہور واپس جا رہے ہیں آپ کی دوسری غزل بھی ارسال خدمت ہے۔ امید ہے کہ مناسب طور پر پہنچ جائے گی۔

میں نے تو غزل کہنا تقریباً چھوڑ دیا ہے اور محفلوں کی شرکت بھی نہ ہونے کے برابر ہے کیا کروں رنگ زمانہ نے مجبور کر دیا اب اگر کوئی نیڈی قسم کی پوشاک زیب تن کرنا نہ چاہے تو بہتر ہے کہ حتی الوسع گوشہ نشینی ہی اختیار کر لے۔ رنگ زمانہ میری خاطر سے کیوں بدلے اور میں اس کے خلاف کوئی اور توقع ہی کیوں کروں۔

شمسی صاحب کے دو خطوط آ چکے ہیں کہ ان کے پرچہ شہید کے لئے اپنی کوئی نظم بھیج دو تا کہ محرم نمبر میں شائع ہو سکے۔ میں نے انھیں فی الحال لکھ دیا ہے کہ نومبر میں جو مجلس میں نے پڑھی تھی اس میں بعضوں کی طرف سے سرد مہری کا مظاہرہ دیکھنے کے بعد کس دل سے اپنا کلام وہاں طبع ہونے کے لئے روانہ کروں خدا کرے اب پھر اصرار نہ کریں۔

اب آج کل اسی فکر کا زمانہ آ گیا کہ نیا مرثیہ کیا ہو مگر ماحول موافق نہیں ہے۔ محرم آئے طبیعت کچھ اس طرف رجوع ہوا بھی تو مغائرت ہی ہے۔ امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

خیر اندیش۔

آل رضا "

چوتھا مکتوب

(۱۲۔ مارچ ۱۹۶۳ء)

میں نے ۶۔ مارچ ۶۳ء کو ایک غزل برائے اصلاح ارسال کی تھی اور یہ درخواست کی تھی کہ میں آپ پر ایک مبسوط مقالہ تحریر کرنا چاہتا ہوں تا کہ اہل علم و ادب کو آپ کی مرثیہ گوئی کے اہم نکات کا علم ہو سکے میں نے یہ بھی تحریر کیا تھا کہ ناقدین ادب آپ کے مرثیوں کی تعداد بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں اور آپ پر کچھ لکھنا بھی چاہتے ہیں یہ خط میرے اسی خط کے جواب میں ہے انھوں نے اس خط میں اپنے فن پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

" کراچی۔

۱۲۔ مارچ ۱۹۶۳ء

مکرمی۔ تسلیم

اسی وقت یہ پرچہ ملا اور فوراً واپس ہو رہا ہے۔ مباحثے پر میری کوئی نظم نہیں ہے مرثیے میں کہیں کہیں حوالے ہیں وہ اس موقعے پر بیکار ہو گئے بندے کے دو مرثیے جو ابتدائی تھے شائع ہو چکے ہیں۔ مگر صرف انھیں رکھ کر میری مرثیہ گوئی پر مضمون لکھنا مناسب نہ ہوگا۔ میں جس مقصد کے لحاظ سے مرثیہ کہتا ہوں اسکا اندازہ میرے باقی آٹھ مرثیوں کو اطمینان سے پڑھ کر ہو سکتا ہے۔ اور اسی وقت یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ میں کہاں تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوا ہوں میری شاعری نموداری کی خواہش سے بالکل بے تعلق ہے باوجودیکہ اظہار مطلب کے وقت اپنی حد تک تمام شاعرانہ صلاحیتوں کو کام میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نے بلحاظ موضوع نیز بہ لحاظ زبان و قواعد عروض اپنے اوپر سخت پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ آخر الذکر کا لحاظ جتنا غزل میں کرتا ہوں اتنا ہی مرثیے میں بھی جو غالباً اور جگہ اس حد تک نہیں ہوتا۔ یہ موضوع ایک مفصل اور اہم ملاقات کا طالب ہے۔ اگر میری زندگی میں اسکا موقع حاصل ہو جائے تو میں یہ رام کہانی سنا ڈالوں اور آپ جو نوٹ لینا مناسب سمجھیں مختصراً لکھتے جائیں۔ میرا اصل موضوع حسین اور اسلام ہے حدیث ثقلین کے آئینے میں واقعات محض تحسین یا گریہ کے لئے گڑھتا نہیں ہوں اور اس چیز سے بھاگتا ہوں جسے مبالغہ کہا جاتا ہے۔ بہر حال میں قدیم و جدید مرثیہ گویوں پر اعتراض کرنا بھی نامناسب سمجھتا ہوں اس کے ساتھ جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے اسکی موافقت میں میرے پاس کچھ وجوہ بھی ہیں۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

خیر طلب۔

آل رضا "

پانچواں مکتوب

(۱۳۔ اپریل ۱۹۶۵ء)

میں نے لفافے میں دو غزلیں برائے اصلاح استاد محترم کے پاس ارسال کی تھیں ایک غزل کا مطلع درج ذیل تھا جس میں ان کے خیال میں ایطائے خفی تھا مگر چونکہ آج کل کے شعرا اس عیب کو عیب نہیں سمجھتے اس لئے میں نے بھی قوافی میں تبدیلی نہیں کی عیب بتانے کے باوجود استاد محترم نے بھی اس میں تبدیلی نہ کی صرف "میں بھی روتا ہوں" کی جگہ "میں بھی ہنستا ہوں تم بھی ہنسو" کر دیا۔

آؤ تسکین غم کچھ تو ہو دوستو
میں بھی ہنستا ہوں تم بھی ہنسو دوستو

دوسری غزل کا اصلاح شدہ کاغذ مجھے بھیج دیا اور جن شعروں پر اصلاح کی وہ واپس کرنا بھول گئے میرا مطلع تھا۔

وہ جان و دل کی رقیب اجنبی شناس آنکھیں
مری نہیں ہیں بظاہر ہیں میرے پاس آنکھیں

اصلاح شدہ مطلع درج ذیل ہے۔

رہیں مقامِ تحیر میں با حواس آنکھیں
ادھر ادائیں ادھر یہ ادا شناس آنکھیں

حسن اختر صاحب پرنسپل حبیب پبلک اسکول کراچی نے اپنے اسکول میں میرا تقرر تو کر دیا لیکن جب مشاہرے کی بات چلی تو اتنی کم تنخواہ بتائی کہ اس میں کراچی میں رہ کر گزر اوقات مشکل تھی۔ میں نے استاد محترم کو تحریر کیا تھا کہ شاید میں مستقلاً کراچی آجاؤں ان کے خط میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

ریاض حسینی فردوس کالونی کراچی۔

۱۳ اپریل ۱۹۶۵ء

مکرمی ہاشمی صاحب تسلیم!

۲۵۔ مارچ کا پوسٹ کارڈ ۲۹۔ مارچ کا لفافہ اور یکم اپریل کا لفافہ میرے سامنے ہیں۔ ان

لفافوں میں آپ کی غزلیں بھی ہیں۔ میں سرگودھا نہیں گیا ورنہ غالباً ضرور پہنچتا۔ یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آپ کی کراچی آ جانے کی ایک دوسری سبیل نکل آئی خدا راس لائے۔

آپ نے غزلیں علیحدہ پرچے پر نہیں لکھیں ورنہ اصلاح کر کے واپس کرنے میں سہولت ہوتی خیر ایک کو تو میں نے خط سے الگ کر لی دوسری پھر سے لکھے دیتا ہوں۔

بہر تسکین غم کچھ کرو دوستو
میں بھی روتا ہوں تم بھی ہنسو دوستو

☆

آؤ تسکین غم کچھ تو ہو دوستو
میں بھی ہنستا ہوں تم بھی ہنسو دوستو

۲۔ جاگنا ہے نصیب سحر تک مجھے.........رات بھیگی ہے تم سو رہو دوستو

بھیگی کی جگہ آئی کر لیں۔ آئی کو بھیگی سے اس لئے بہتر سمجھتا ہوں کہ آخر لذکر سے زیادہ رات گزرنے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

۳۔ روز روشن کو تاریکیاں کھا گئیں.........دل جلا کر اجالا کرو دوستو

اس شعر میں صرف یہ قباحت ہے کہ کس کا دل جلا کر اجالا کرو۔ اپنا دل کہنا مقصود ہے مگر بیان کی تشنگی ظاہر ہے شمع دل کا اجالا کرو کہنے میں یہ قباحت دور ہو جاتی ہے مگر اس صورت میں اپنے دل کو جلا کر روشنی پیدا کرنے کی خوبی نہیں رہتی۔

۴۔ صرف باتوں سے کٹتی نہیں منزلیں.........دو قدم حوصلہ تو کرو دوستو

اس شعر میں کسی ترمیم کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اسی طرح آپ کا یہ شعر بھی ہے۔

۵۔ میرا اللہ کافی ہے میرے لئے.........تم ہر اک بت کو سجدہ کرو دوستو

۶۔ اب گلستاں پہ پہرے ہیں صیاد کے.........اب بیاباں بیاباں پھرو دوستو

طائر کا استعارہ ہے مگر طائر کا بیاباں سے کیا تعلق؟ یوں کر دیجئے۔

اب گلستاں گلستاں بہاریں کہاں .... اب بیاباں بیاباں پھرو دوستو

ے۔ روک لی ہے زمانے نے میری زباں .... حق کی خاطر تمہی کچھ کہو دوستو

شعر صاف ہے مگر دیکھیے زور بیاں کے لحاظ سے شاید یہ صورت بہتر ہو۔

تابہ کے تابہ کے چپ رہوں .... کچھ کہو کچھ کہو کچھ کہو دوستو

آپ نے مطلع لکھا تھا اس میں ایطائے خفی ہے جس سے میں احتراز کرتا ہوں کرو اور فسو کے قوافی میں "و" نکال کر کر اور فس رہ جاتے ہیں اور یہ ہم قافیہ نہیں آپ لوگ شاید اس کا لحاظ نہیں کرتے یہی طریقہ عام ہے۔

آپ کی دوسری غزل کا قافیہ اشعار کی روانی اور بے ساختہ لطف شعری کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ کے اشعار اچھے خاصے ہیں مطلع البتہ مجھے پسند نہیں ہے اور اسی طرح بد حواس والا شعر۔ مطلع میں مصرع اول بالکل نہیں لگا۔ دوسرا مصرع تو معنی دے رہا ہے اس شعر میں یہ تقاضا کس کی جانب سے ہو سکتا ہے۔ محبوب یا عاشق خیر پھر کسی وقت غور کرونگا۔ امید کہ آپ مع الخیر ہونگے اپنے ہم مذاق ہم جلیسوں کو میرا سلام کہہ دیجئے گا۔

دعا گو۔

آل رضا"

چھٹا مکتوب

(۱۲۔ جولائی ۱۹۶۵ء)

میری پہلی غزل کا مطلع تھا۔

نہ جانے وہ کیوں رک گئے بات کر کے .... نظر پھیر لی خود ملاقات کر کے

دوسری غزل کے دو اشعار درج ذیل تھے۔

تھے تو دیوانے مگر نکلے بڑے کام کے لوگ
جاگ اٹھا ہے زمانہ یہ جدھر گزرے ہیں

پھول تو پھول ہیں خاروں میں بسی ہے خوشبو
دل یہ کہتا ہے یقیناً وہ ادھر گزرے ہیں

ڈاکٹر صفدر حسین مرحوم نے مجھ سے کہا کہ میں اپنا مرثیہ شائع کرنا چاہتا ہوں میری خواہش ہے کہ اس پر آل رضا صاحب میری خوانندگی کے بارے میں کچھ لکھ دیں وہ آپ کے استاد ہیں ان سے کہئے کہ ایک مضمون تحریر کردیں میں بھی گزارش کرونگا۔ میں نے استاد مرحوم کو پُر زور خط تحریر کردیا۔ ڈاکٹر صاحب کراچی گئے اور مضمون حاصل کرکے لاہور آئے اور کسری منہاس مرحوم نے جو "رضا کار" میں اعزازی کام کرتے تھے اسے شائع کردیا۔ میں نے وہ مضمون رضا کار ہی کی اشاعت میں دیکھا۔ استاد مرحوم ڈاکٹر صاحب کے مرثیوں کی خوانندگی کے تو قائل تھے مگر ضرورت سے زیادہ اشارات کو مجلس کے لئے مفید نہیں سمجھتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب تو دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن انہی کے ساتھ مرثیے کی پڑھت کا فن بھی دفن ہو گیا۔

"ریاض حسینی فردوس کالونی کراچی

۲۱۔ جولائی ۱۹۶۵ء

عزیز محترم تسلیمات

آپ کے پوسٹ کارڈ کا جواب امامیہ مشن کے پتے سے بھیج چکا ہوں۔ غزل نمبر ا میں ایک جگہ اور غزل نمبر ۲ میں دو جگہ کے علاوہ کہیں اور مداخلت کی ضرورت نہیں معلوم ہوئی جن الفاظ کے نیچے پنسل کی لکیریں بنی ہیں وہ میں نے نہیں بنائی ہیں غالباً آپ ہی نے ان مقامات پر تبادلۂ خیال کی ضرورت سمجھی ہو۔ مذکورہ بالا آخری شعر میں "مری بات کرکے" اچھا معلوم نہیں ہوتا شاید غلط تو نہ ہو یا تمیں کرکے ہونا چاہئے تھا مگر قافیے کے لحاظ سے اس کی گنجائش نہیں یہ شعر نکال ہی دیجئے تو بہتر ہے۔ بات کرکے آپ نے کوئی خاص فائدہ بھی نہیں اٹھایا۔ مثلاً پہلے مصرع میں اگر کسی قسم کی گفتگو کا ذکر ہوتا تو پھر

یہ قافیہ کارآمد ہو جاتا۔

غزل نمبر ۲ میں ادھر گزرے اور جدھر گزرے کی جگہ ٹکسالی زبان کے مطابق ادھر سے گزرے اور جدھر سے گزرے ہونا چاہئے مگر اس زمانے میں یوں بھی غلط نہیں کہا جاسکتا۔

رضاکار لاہور کے محرم نمبر میں میرا ایک مضمون چھپا ہے جو مجھ سے ڈاکٹر صفدر حسین نے اپنی خوانندگی کے متعلق لکھوایا تھا انھوں نے وہ مضمون رضاکار میں اس لئے چھپوایا تاکہ کہیں اسکا جواب چھپوائیں۔ آج کل وہ جوہر آباد میں کالج کے پرنسپل ہیں ابھی کراچی میں مجلس پڑھنے آئے تھے یہاں آکر یہ مشہور کیا کہ وہ مضمون آل رضا نے "رضاکار" میں چھپوایا ہے۔ میں نے آپ کی فرمائش پر قلم برداشتہ وہ مضمون لکھا تھا جسے وہ اپنے مرثیے کے ساتھ چھپوانے والے تھے میں نے اسکی کوئی نقل بھی اپنے پاس نہیں رکھی تھی۔

براہ کرم آپ دفتر رضاکار سے پتہ لگائیں کہ یہ مضمون کس نے بھیجا اور وہاں کیوں کر پہنچا۔ افسوس کہ ان کی خوشامد میں آکر پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہوں جو انشاء اللہ اب کبھی نہ ہوگا۔ یہ ایک بڑی طویل اور افسوسناک داستان ہے۔

آپ نے تو ان کو مرثیہ پڑھتے سنا ہے خوب پڑھتے ہیں اور بڑی محنت سے پڑھتے ہیں لیکن منبر پر بیٹھ کر ہاتھ پیر اور منہ کو جنبش دیتے ہیں جو وقار منبر کے لحاظ سے اوور ایکٹنگ ہو جاتی ہے۔

آپ میرے مضمون کا بغور مطالعہ کریں دیکھئے میں نے کتنی احتیاط بلکہ ایک حد تک جنبہ داری سے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ امید ہے آپ مع الخیر ہونگے۔

دُعاگو۔

آل رضا"

ساتواں مکتوب

(۲۸۔ جنوری ۱۹۶۶ء)

استاد مرحوم نے ایک نیا مرثیہ کہا جس کا مطلع ہے۔ "انیس اہل ادب ہے وقار منبر کا"۔ اس

مرثیے میں انھوں نے کہا کہ مجھ سے قبل مرثیے کے بڑے بڑے صاحبان کمال گزرے ہیں جو ادب کا خزانہ مالا مال کر گئے اب ان کے بعد......

میں اور یوں سر منبر فشار عقل کروں
جو مجھ سے ہو نہیں سکتا میں اسکی نقل کروں

آگے کہتے ہیں کہ میں نے ان بزرگوں سے درس لے کر ایک نئی راہ نکالی ہے جس سے کسی کا گریبان چاک نہیں ہوا پھر بھی کچھ لوگ میرے اس رنگ سخن میں عیب نکال رہے ہیں حالانکہ۔

کلام میرا نقائص سے پاک ہی کب ہے
جو عیب جو ہیں انھیں عیب ہی سے مطلب ہے

پھر کہتے ہیں کہ سرداری انیس و دبیر میرے سر آنکھوں پر

مگر یہ کیا کہ رہوں بس لکیر ہی کا فقیر

میں ان کی تمام خوبیوں کو قابل وقعت خیال کرتا ہوں لیکن

میں اسکو مال غنیمت نہیں سمجھتا ہوں

پھر کہتے ہیں کہ.........

چلا کرے گا کہاں تک یہ محترم دستور
وہی کہو جو وہ کہتے تھے ورنہ بزم سے دور

یہ مجلسوں کا تبرک ہے بے شمار بنے
جو ایک بار بنا ہے وہ بار بار بنے

کلام غیر کو اپنا لیا تو کیا حاصل
اول بدل کے وہی رکھ دیا تو کیا حاصل

پھر کہتے ہیں کہ ہم نے بڑے ریاض سے یہ فضا بنائی ہے اور اسے گروہ بندی سے پاک کیا ہے خدا کرے کہ وہی فضا قائم رہے کراچی کے کچھ مرثیوں گویوں نے ان ابیات کو اپنے اوپر حملہ تصور کیا اور یہ کہنے لگے کہ آل رضا انیس و دبیر کی مرثیہ گوئی کے مخالف ہیں اسی سلسلے میں اس مرثیے کے جواب میں کئی مرثیے کہے گئے۔ اپنے اس خط میں مرحوم نے ان حضرات کے عزائم اور اپنے

مقاصد مرثیہ گوئی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

"۱۲۔ کورٹ چیمبرز کراچی

۲۸۔ جنوری ۱۹۶۶ء

گرامی قدر سلامت رہئے

ابھی ابھی آپ کا پوسٹ کارڈ ملا۔ پرسوں آپ کے سابق مکتوب کا جواب روانہ کر چکا ہوں۔ تعمیل ارشاد میں وہ بند ملفوف کر رہا ہوں جو ان حضرات کے جواب میں عرض کئے تھے جس نے جدید مرثیہ نگاری خصوصاً میرے کلام کے متعلق یہاں کی نہایت خوشگوار فضا کو بگاڑنا چاہا تھا چونکہ یہ ایک اصولی امر تھا جس کا جواب مرثیے ہی میں ضروری تھا اس لئے مجھ کو مجبوراً اپنا موقف واضح کرنا پڑا اس شخص کو اس کا جواب تو بن نہ پڑا لگا اول فول بکنے لگا اور دھاندلی کا یہ عالم ہے کہ اپنی ایک کتاب میں اس میں سے کچھ بند لکھ کر مجھے بدنام کرنے کی کوشش کی ہے اچھا ہوا کہ انھوں نے کچھ بند لکھ دیئے جن کو ہر ذی فہم اور منصف مزاج پڑھ کر حقیقت سے خود ہی مطلع ہو سکتا ہے اب آپ پورے ۷ ابند شائع کر دیں کہ حقیقت اور زیادہ روشن ہو جائے۔ بے بنیاد اعتراضات کے مسکت جواب کو وہ تعریض کہتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ وہ اسی قسم کی حرکت کریںگے لہٰذا میں نے میر انیس کے ایک سلام میں مصرعے بھی نظم کر دیئے اگر یہ تعریض ہے تو وہ میر صاحب کے مصرعے کیا ہیں۔ یہ بھی خوب ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ انسان کو سچ بولنا چاہئے یا چوری نہ کرنا چاہئے تو ہر جھوٹا یا چور بگڑ بیٹھے کہ یہ تو میری برائی کی گئی۔ میں نے تو صرف یہ ظاہر کیا ہے کہ میں کن کن باتوں کا لحاظ کرنے کی کوشش کرتا ہوں الحمد اللہ کہ کہیں پر اشارتاً یا کنایۃً بھی دوسروں پر اس برتری جتانے کی نامعقول سعی نہیں کی ہے یہ امر ہی میری طبیعت کے خلاف ہے۔ یہاں کی وہ فضا جو تحت اللفظ خوانی نے آراستہ کر رکھی اسکا بہت کچھ ذمہ دار میں ہوں اور اس ذمہ داری کے لحاظ سے میرے دل کی یہ تڑپ بے جا نہیں ہے کہ کم سے کم میری زندگی میں کوئی حاسد یا مفسد اس فضا کو خراب نہ کرنے پائے۔

غضب خدا کا جب کچھ اور نہ ملے تو ہمارے رنگ مرثیہ گوئی کو یہ کہہ کر بدنام کیا جائے کہ یہ قدما کے رنگ مرثیہ گوئی کے خلاف بغاوت ہے۔ جس میں ان بزرگوں کی ہتک ہوتی ہے۔ میاں کوئی کچھ کہے واقعہ تو یہی ہے کہ وہ حضرات اتنا اچھا اور اتنا زیادہ کہہ گئے ہیں کہ اب مجھ ایسے کم بضاعت شاعر کے لئے اس رنگ میں نقل اور سرقہ کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار ہی نہیں تھا اور اب جو مرثیہ گو یہ حرکت نہ کریں تو گویا وہ ان بزرگوں کی ذلت کرتے ہیں۔ کیا خوب جب میں نے یہ بند کہے تھے اس وقت تو یہ لوگ صرف دوسروں کا کلام پڑھتے تھے اور اب چلے ہیں تمام مرثیہ گویوں کی اس مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹنے جسکے خلاف بہ زعم خود میں نے طعن و تشنیع کی ہے۔ دن کو رات کہہ کر اس پر اصرار کئے جانا ایسے ہی ضدی اشخاص کا کام ہے۔ مجھے تعجب تو یہ ہے کہ اب کوئی ادیب یا منصف مزاج شخص ایسا نہیں رہا جو اس صریحی بیہودگی کو روکے۔ میں خود اب ان کے منہ لگنا نہیں چاہتا۔ ایک اصولی فرض تھا جو ایک مرتبہ ادا کر دیا۔ میں اپنی مرثیہ گوئی ختم کر چکا جو چودھواں مرثیہ کہنے کی فکر ہے اور بس میری مرثیہ گوئی ایک مقصد کے تحت تھی اور خدا کا شکر ہے کہ وہ مقصد ۳۹ء سے لے کر اب تک توقع سے زیادہ پورا ہو چکا ہے اور بارگاہ حسینی سے وہ عطیہ حاصل ہوتا رہا ہے کہ جس کا شکر ادا کرنا میرے بس سے باہر ہے چاہتا ہوں کہ ایک مرثیہ انشاءاللہ میرے ساتھ قبر میں بھی جائے۔ "بہار پر ہے زمانہ نزول قرآں کا"۔ وصیت کر دی ہے مقطع میں بھی عرض کیا ہے۔

جو ہو سکے تو اسے قبر میں بھی لے جانا
یہ مرثیہ ہے رضا کربلا کا پروانا

میں نے جب یہ مرثیہ کہہ کر ختم کیا تھا تو اسی زمانے میں کربلا معلی سے راجہ صاحب محمود آباد کا گرامی نامہ پہنچا کہ تمہاری طلبی ہو چکی ہے فوراً چلے آؤ اور بحمد اللہ مجھے یہ سعادت نصیب ہو گئی۔ میرے دونوں مرثیے اب آپ واپس کر سکتے ہیں۔ توجہ فرمایئے میرے دونوں لڑکوں میں سے کسی کے یہاں بھجوا دیجئے۔ اس مرثیے کی طباعت اور اشاعت کے معاملات آپ ہی لوگ مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ سابق عریضے میں آپ کی اور سب باتوں کا جواب دے چکا ہوں۔ جس مرثیے کے بند ملفوف کر رہا ہوں

وہ ارشاد کراچی کے محرم نمبر میں گذشتہ سے پیوستہ شائع ہو چکے ہیں اس سے پہلے بھی دس بارہ بند اسی زمانے میں شائع ہوئے تھے جب یہ مرثیہ پہلی بار پڑھا گیا تھا۔

افسوس کہ ان معروضات میں کچھ غیبت کا شائبہ آرہا ہے مگر یہ بیان شاید اس لحاظ سے قابل معافی ہو جائے کہ مرثیہ گوئی پر فضول اعتراضات کے ذکر کے سلسلے میں کیا کیا جارہا ہے امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

عریضہ احقر۔

آل رضا "

آٹھواں مکتوب

(۳۰۔ ستمبر ۱۹۶۶ء)

اگرچہ میں قزلباش ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا مگر میری ماہانہ تنخواہ قلیل تھی سو روپے سے زائد کی رقم تو اسکول میں مہمان داری میں خرچ ہو جاتی تھی بقیہ رقم سے دس افراد پر مشتمل کنبے کا خرچ چلانا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا اس لئے میں لاہور کے بجائے کراچی منتقل ہونا چاہتا تھا استاد محترم نے اپنے شاگرد حسن اختر صاحب پرنسپل حبیب پبلک اسکول کراچی سے بات بھی کر لی تھی اور میرے لئے رہائش کا بندوبست بھی کر لیا تھا مگر جب میں انٹرویو کے لئے گیا تو سیٹھ صاحبان نے اتنی کم تنخواہ دینے کا وعدہ کیا کہ اس رقم میں کراچی میں رہائش دشوار تھی اس لئے یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

مرثیہ "عظمت انساں" لاکر میں نے ابرار شیرازی مرحوم کے حوالے کیا تا کہ اسکی اشاعت کا کام شروع ہو شیرازی مرحوم نے بطور ایڈوانس کچھ نقد رقم کا مطالبہ کیا جسے میں نے استاد محترم کے گوش گزار کر دیا۔ انھوں نے اس مطالبے کو نامنظور کرتے ہوئے یہ کہا کہ اشاعت کے بعد کچھ کتابیں اصل قیمت پر خرید لی جائینگی اس وعدے پر اشاعت کا کام شروع ہو گیا اور کتاب شائع

ہوگئی۔

" فردوس کالونی کراچی۔

۳۰۔ ستمبر ۱۹۶۶ء

محبی تسلیم۔ محبت نامہ ۲۵۔ ستمبر موصول ہوا۔ اس سے پہلے جو پوسٹ کارڈ ملا تھا اسکے مضمون سے ظاہر ہوتا تھا کہ آپ عنقریب کراچی منتقل ہو رہے ہیں میں نے ایک مناسب مکان بھی آپ کے لئے طے کرلیا تھا اور مالک مکان سے کہہ دیا تھا کہ وہ آپ کا انتظار کرے۔ آج میں نے حبیب پبلک اسکول کے پرنسپل صاحب کو فون کیا کہ تقرری کی باقاعدہ تحریر آپ تک نہ پہنچنے کا کیا سبب ہے انھوں نے کہا فی الحال وہ اسکیم معرض التوا میں پڑ گئی ہے۔ بڑا تعجب اور افسوس ہوا۔

مرثیے کے متعلق پبلشر صاحب نے اپنے منصوبے میں جو ترمیم کی ہے اس کے متعلق غور کرونگا۔ آپ نے پہلے جو تجویز کیا تھا اس کے بارے میں میں نے تفصیلات دریافت کئے بغیر مرثیہ آپ کے حوالے کردیا تھا کہ بعد کو آپ سے اور باتیں دریافت کرلونگا۔ مگر اب صورت دوسری معلوم ہوتی ہے۔ خیر بشرط حیات دیکھا جائے گا۔ یہ مرثیہ اب آپ کسی معتبر ذریعے سے مجھے واپس کردیں۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہونگے۔

خدا حافظ۔

آل رضا "

نواں مکتوب

(۹۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء)

استاد محترم سے میں نے ان کا مرثیہ "عظمت انساں" طلب کیا تھا جسے انھوں نے بڑی مشکل سے میرے حوالے کیا۔ یہ مرثیہ میں نے مکتبہ تعمیر ادب کے مالک ابرار شیرازی صاحب کے سپرد کردیا۔ کراچی میں یہ خبر عام تھی کہ کچھ مرثیہ نگار قدیم مرثیہ نگاروں کے مصرعے جیتیں اور

بند اپنے مرثیوں میں شامل کر کے بڑی بے باکی سے پڑھ رہے ہیں میں نے استاد محترم سے اس بات کا ذکر کیا تو انھوں نے اقرار میں جواب دیا اور کہا کہ یہ اس لئے ہو رہا ہے کہ قدیم اساتذہ کے کلام سے اب لوگ واقف نہیں ہیں اس لئے جو سرقہ کرتا ہے وہ یہ سمجھ کر کرتا ہے کہ مجلس کے سامعین بے خبر ہیں مگر اب بھی کراچی میں چند دقیق نگاہ رکھنے والے موجود ہیں جن کی یادداشتوں میں اکثر اہم مرثیوں کے بند محفوظ ہیں میں نے استاد محترم سے درخواست کی کہ چند ایسے اقتباسات مجھے بھی عنایت کر دیں تا کہ میں ایسے حضرات سے باخبر ہو جاؤں۔

" فردوس کالونی کراچی۔

۱۹۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء

مجی تسلیم۔ محبت نامے کا شکریہ۔ آپ کو مجھ سے جو خلوص ہے اس کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ میرے کہے ہوئے مرثیوں کی طباعت و اشاعت میں جو آپ کو دلچسپی ہے وہ بھی صرف اسی خلوص کا نتیجہ ہے۔ آپ دوسرا مرثیہ طلب کر رہے ہیں۔ میں بھیج دونگا۔ میرے پاس ان مرثیوں کی نقلیں نہیں ہیں۔ اصل ہی حاضر کرتا ہے کوئی معتبر شخص لاہور جانے والا ملے تو اس کے ہاتھ روانہ کر دوں۔ آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انشاءاللہ جلد ہی تعمیل ارشاد ہو جائے گی۔ جو کچھ مجھے تامل تھا وہ صرف اسلئے کہ مطبع والوں یا تبصرہ نگاروں کے متعلق مجھے تلخ تجربے ہو چکے ہیں جن اہل قلم کا آپ نے ذکر کیا ہے معلوم نہیں وہ حضرات معقول دلچسپی لینگے یا نہیں لینگے۔ بارہا عرض کر چکا ہوں کہ میں ایک خاص مقصد کے تحت مرثیے نظم کرتا ہوں جن کو صرف وہی شخص قدر کی نگاہوں سے دیکھ سکتا ہے جو میرا ہم خیال ہو جس میں کہ معتقدات کا بھی سوال ہے۔ محض شاعری یا نقالی میری مرثیہ گوئی سے کوسوں دور ہے۔ نقالی یا اساتذہ کے کلام میں ادھر ادھر سے سرقہ کر کے مرثیہ تیار کر لینا تو میرے لئے حرام ہے رنگ قدیم میں مرثیہ کہنے والے اب سینہ زوری سے کام لینے میں سمجھتے ہیں کہ پرانا کلام کس کو یاد ہے اگر دو تین فیصدی افراد جانتے بھی ہیں تو ان کی شہرت پر اس کا کوئی اثر پڑ نہیں سکتا۔ زیادہ تر لوگ اپنی لاعلمی میں تعریف کرنے پر آمادہ ملینگے۔

میں نے ایک صاحب سے جو اس معاملے میں دقیق نظر رکھتے ہیں کہا ہے کہ وہ آپ کے لئے کچھ سامان مہیا کر دیں۔ امید کہ آپ مع الخیر ہونگے۔

خدا حافظ۔

آل رضا "

دسواں مکتوب

(۲۔ نومبر ۱۹۶۶ء)

اب جو مرثیہ آیا وہ وہی ہے جو میں لایا تھا مگر اس میں کئی مصرعے کئی بیتیں تبدیل کر دی گئیں اور دو چار بند کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ میں نے اپنے خطوط میں مرثیے کی مناسب اشاعت کا وعدہ کیا تھا اور استاد محترم کو یہ یقین دلایا تھا کہ صحت الفاظ کا میں خود ذمہ دار ہونگا۔ اسی میری یقین دہانی پر یہ خط وصول ہوا۔

" فردوس کالونی کراچی۔

۲۔ نومبر ۱۹۶۶ء

مکرمی تسلیم۔ جمعہ ۲۸۔ اکتوبر کو مرثیہ محترمی سید فضل حسین صاحب کے یہاں پہنچا دیا گیا تا کہ آپ تک پہنچ جائے۔ یہ میں نے صرف آپ کی فرمائش کی تعمیل کی ہے ورنہ میں خود اس معاملے میں بہت تامل کرتا ہوں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ میری مرثیہ گوئی ایک خاص مقصد کے تحت ہوتی ہے اور وہ مقصد بحمد اللہ عرصے سے پورا ہوتا چلا آ رہا ہے۔ ہمارے نوجوان بہت بہکے ہوئے ہیں زمانے کے رنگ کا ان پر بھی ہونا چاہئے تھا۔ اگر میرے ہاتھوں تھوڑی بہت اصلاح ہو جائے تو میرے نزدیک وہ بہت بڑا کام ہے۔ اسکے علاوہ کچھ شیعی اقدار ہیں جو دوسرے لوگ محض اس لئے پسند کرتا نہیں چاہتے کہ وہ ایک فرقے سے متعلق ہیں۔ علم' عدل' عصمت اور جہاد نفس کے مخصوص کارنامے وغیرہ وغیرہ۔ میں ان مرثیوں کے

ذریعے سے ان چیزوں کی اہمیت ضرورت اور معقولیت کو طرح طرح سے پیش کر کے یہ کوشش کرتا ہوں کہ لوگ بحث کے بغیر ان پر غور کریں اور حضرات مرثیوں میں جو خزانہ جمع کر چکے ہیں یا اب ان میں اضافہ کریں وہ اپنی جگہ قابل قدر ہو۔ جو اور جگہ نہیں ہے وہ بھی اگر مناسب طریقے سے پیش کر دیا جائے تو کچھ اضافہ ہی ہے۔

آپ کے پاس میرے دو مرثیے ہیں آپ جس طرح مناسب سمجھیں انھیں طبع اور شائع کریں۔ ان مرثیوں میں بعض بند اس طرح سے اضافہ کئے گئے ہیں (۱/۱-۳۱/۱-۷۰) وغیرہ یہ بند بعد کو کہے گئے تھے اس وجہ سے ان پر نمبر بھی اسی طرح ڈال دیئے گئے مگر کتابت میں ایسا نہ ہونا چاہئے اسی طرح کا بند بعد کے نمبر کے ساتھ لکھا جائے اور اس کے بعد کے بند کا نمبر حسب ترتیب ہو جائے۔

خدا حافظ۔

آل رضا"

گیارہواں مکتوب

(یکم دسمبر ۱۹۶۶ء)

دوسرے مقالہ نگاروں کی طرح میں نے ڈاکٹر صفدر صاحب سے بھی التجا کی کہ مرثیہ "عظمت انساں" پر ذاتیات سے مبرا کوئی مقالہ تحریر کردیں تاکہ شامل اشاعت ہو جائے۔ ایک ماہ بعد میں نے پھر انھیں یاد دلایا کہ آپ کا مقالہ ابھی تک موصول نہیں ہوا مگر وہ میری بات سن کر ٹال گئے انھوں نے آل رضا صاحب کو خط لکھ کر معذرت کر لی۔

آل رضا صاحب کسی مرثیہ گو کے بدخواہ نہ تھے بلکہ وہ ان افعال کے خلاف تھے جو مرثیے کی بقا کی راہ میں رکاوٹ بنیں مرثیے کی بقا کے سلسلے میں ان کا درج ذیل جملہ قابل غور ہے۔

"میں جن لوگوں پر مرثیے کی بقا کا دارومدار سمجھتا ہوں ان میں بہ مشکل دو تین نام ہی لئے جا سکتے ہیں ایک تو آپ ہی ہیں سبحان اللہ میں نے سنا بھی ہے آپ خوب کہتے ہیں لاہور میں ڈاکٹر صفدر

حسین ہیں وہ پڑھتے اچھا ہیں (جدید مرثیے کے تین معمار۔ڈاکٹر ہلال نقوی ص ۴۸)"

ڈاکٹر صفدر صاحب نے سید آل رضا صاحب کے اس مرثیے کا نام عزم حسین تجویز کیا تھا جسے انھوں نے ناپسند کیا۔

" کراچی۔

یکم۔دسمبر ۱۹۶۶ء

مکرمی تسلیم۔۱۲۔نومبر کے گرامی نامے سے معلوم ہوا کہ آپ نے مسودہ بذریعہ رجسٹری میرے نام ارسال فرمایا ہے لیکن یہ آج تک مجھے نہیں ملا۔

صفدر صاحب نے مجھے لکھا ہے کہ ان سے دو مرتبہ فرمائش کی گئی کہ وہ میرے کہے ہوئے اسی مرثیے پر نقد و تبصرہ فرمائیں مگر انھوں نے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ کہیں جذبات کی رو میں ان کے قلم سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو میری طبع نازک پر گراں ہو۔میں ان کا بدخواہ نہیں ہوں مگر بے تعلق رہنا چاہتا ہوں۔

میرے نزدیک ان کا تجویز کردہ نام مرثیے کے پورے موضوع پر حاوی نہیں ہے آیۂ ذبح عظیم کی جو اہمیت ہے اور خون علوی نے اسلام کی جو خدمت کی ہے اس کا ذکر اس مرثیے میں خصوصی درجہ رکھتا ہے کسی نام کی کیا ضرورت ہے پہلے تو مرثیوں کے نام نہیں ہوتے تھے۔صفدر صاحب نے کسی بارگاہ ادب لاہور کی جانب سے میرے مرثیے چھپوانے کی تجویز پیش فرمائی تھی مگر میں نے عرض کر دیا کہ بعض تلخ تجربات کی وجہ سے میں اس معاملے میں تعاون کرنے سے قاصر ہوں۔

آپ اگر خود میری رائے نہ لکھوائیے تو بہتر ہے کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں ہے بجز ایک امر کے اور اگر کھول کر بیان کر دیا گیا تو جو میرا مقصد تبلیغ ہے وہ فوت یا مجروح ہو جائے گا۔امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

احقر۔

آل رضا "

بارہواں مکتوب

(۱۱۔دسمبر ۱۹۶۶ء)

مرثیہ ''عظمت انساں'' کا مطبوعہ مسودہ میں نے مرحوم کو اس لئے روانہ کیا تا کہ کوئی بھی لفظ غلط شائع نہ ہو سکے علاوہ جتنے مقالے مجھے ملتے گئے انھیں بھی ارسال کرتا گیا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک مضمون مرثیہ نگار کا بھی شامل کتاب ہو مگر مرحوم نے میری رائے سے اتفاق نہ کیا بلکہ مجھے یہ رائے دی کہ پچیس سال پرانا مضمون شائع کر دیا جائے حالانکہ ربع صدی میں تنقید کہیں سے کہیں پہنچ گئی اور آج تنقید وہاں پاؤں جمائے کھڑی ہے جہاں کل ڈگمگا رہی تھی۔ اس لئے اس کتاب میں وہ قدیم مضمون شامل نہ ہو سکا۔ البتہ اس خط میں انھوں نے اپنے رنگ مرثیہ گوئی کے بارے میں کچھ باتیں کی ہیں۔ کسی فن یا کسی رنگ کا موجد کوئی ایک آدمی نہیں ہوتا بلکہ وہ معاشرہ ہوتا ہے جس میں وہ آدمی سانس لیتا ہے لیکن فن کے موڑ کو بدلنے والا ایک شخص ہوتا ہے جس کے کلام میں کچھ نئی باتیں کچھ نئی اصطلاحیں اور کچھ نیا اسلوب نظر آتا ہے انھیں اسباب کی بنا پر لوگ اسے موجد کہنے لگتے ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں سید آل رضا مرحوم نے رنگ جدید میں ایک مرثیہ کہا اور کہا گیا کہ جدید رنگ کا یہ پہلا مرثیہ ہے بس پھر کیا تھا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا کسی نے ایک مرثیہ کہہ کے اس پر سن تصنیف ۱۹۳۰ء رکھ لیا کسی نے ۱۹۳۵ء کے کہے ہوئے مسدس میں ایک نظم میں کچھ نئے بند شامل کر کے اسے ۱۹۳۵ء میں کہا گیا مرثیہ قرار دیا کسی نے جوش ملیح آبادی کے قدیم رنگ کے مرثیے آوازِ حق مطبوعہ ۱۹۲۰ء کو پہلا جدید مرثیہ کہا کیوں کہ اس میں ایک مصرع 'لازم ہے کہ ہر شخص حسین ابن علی ہو'' آیا ہوا ہے۔

میں نے نجم آفندی مرحوم سے پوچھا کہ آپ نے مرثیہ کہنے میں اتنی دیر کیوں کی تو انھوں نے مجھے ایک مرثیے کے آٹھ بند سنا کر کہا کہ یہ مرثیہ میں نے ۱۹۱۸ء میں کہا اور راجہ بنڈراول کے امام باڑے میں ۱۹۱۸ء میں پڑھا جس کی تصدیق مولانا مرتضیٰ حسین کے خسر محترم سید زاہد حسین آغا بارھوی نے کی جو اس مجلس میں شریک تھے نجم مرحوم نے کہا کہ میں نے اس مرثیے کو اس لئے نظر انداز کر دیا کہ وہ میرے رنگ سے تطابق نہیں رکھتا تھا۔ استاد مرحوم نے مجھ سے کہا

بھائی میرے مرثیے سے قبل اگر کسی نے مرثیہ کہہ کر بیٹے میں رکھ لیا ہو تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر میری طرح کسی نے مرثیہ کہہ کر پڑھا ہو اور اخبار میں اسکی روداد آ گئی ہو ایسا نظر سے نہیں گزرا۔

۱۲۔ کورٹ چیمبرز کراچی۔

۱۱۔ دسمبر ۱۹۶۶ء

مکرمی ہاشمی صاحب تسلیم

کل سہ پہر کو مطبوعہ مسودہ (پروف) ملا۔ آپ کے خلوص کا تقاضا یہی تھا کہ فوراً ادھر متوجہ ہوں مگر دقت یہ ہوئی کہ آج اتوار ہے اور رجسٹری نہیں ہو سکتی کل دوشنبہ کو انشاء اللہ تعمیل حکم ہو سکے گی اگر کل تک کوئی لاہور جانے والا مل سکا تو کیا کہنا۔ پہلے ان الفاظ کا ذکر کرتا ہوں جو غلط چھپ گئے ہیں۔

بند نمبر ۲۱	بھی	بجائے	ہی	
بند نمبر ۴۷	کی	بجائے	نی	
بند نمبر ۵۱	نازاں	بجائے	نازل	
بند نمبر ۵۹	انسان	بجائے	اسلام	
بند نمبر ۹۱	آخری	بجائے	ظاہری	
بند نمبر ۱۳۷	لگام	بجائے	نیام	
بند نمبر ۵۲	جسکی	بجائے	جنگی	صرف نقطے کی غلطی ہے
بند نمبر ۴۳	پہنچا	بجائے	بھونچا	
بند نمبر ۳۱	پہنچی	بجائے	بھونچی	صرف طرز تحریر کی غلطی ہے

بند نمبر ۶۹' بند نمبر ۹۵' بند نمبر ۹۸' اور بند نمبر ۱۰۳ پر ذبح عظیم ہونا چاہئے۔ یہ کاتب صاحب (ن) کو اس طرح لکھ دیتے ہیں کہ (ل) معلوم ہوتا ہے۔ میں نے دو ایک جگہ نشان بنا دیا ہے جہاں زیادہ برا معلوم ہوا۔

بند نمبر ۱۵۳ میں گرا کی جگہ میں نے گرے کر دیا ہے یہ بہتر صورت معلوم ہوتی ہے۔ بقیہ جتنے

اصلاحی نشانات میں نے بنائے ہیں وہ چار قسم کے ہیں۔ ہائے ھوز کے نیچے نشان (=) ہے کا
صاحب نے کہیں نشان بنا دئیے ہیں اور کہیں غائب کر دئیے ہیں یہ مناسب نہیں۔ بعض فقرات یا الفاظ
زیادہ واضح کرنے کیلئے (') کا نشان ہو۔ مناسب مقامات پر استعجاب یا سوالیہ نشان (!) یا (؟) ہو۔ بعض
مقامات پر ہمزہ (ء) مثلاً دیکھنے میں یہ علامت زیادہ تر غائب ہے۔ مذکورہ بالا معروضات کے علاوہ
کچھ اور ہو وہ آپ خود ملاحظہ کر لیں۔ آپ نے جن حضرات کے پاس مطبوعہ مواد بھیجا انہیں بھی براہ کرم
ان الفاظ کے متعلق فوراً اطلاع کر دیجئے جو غلط چھپے ہیں ورنہ وہ لوگ مجھے کیا سمجھیں گے۔ احتشام
صاحب کو بھی لکھ دیجئے گا اور ایسے تبصرے حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کیجئے ان کی شخصیت بڑی محترم
ہے اور انہیں مجھ سے خاص دلچسپی بلکہ خلوص ہے میں آپ کی سرگرمی اور مستعدی کو لائق تحسین سمجھتا ہوں
مجھے معلوم ہے کہ آپ اس معاملے میں کس قدر حسن عمل کو دخل دے رہے ہیں۔ ایک بات کا دفع دخل
کر دوں۔ مجھے ہرگز اس کا ذرا بھی خیال نہیں ہے کہ اس مطبوعے میں کوئی خلاف بات نہ لکھی جائے
صاحبان نقد و تبصرہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کریں۔ اپنے خلاف کسی کی غیر ذمہ
دارانہ تحریر کا مجھے مطلق خوف نہیں ہے۔

میں نے اس امر پر پھر غور کیا کہ مجھے بھی اس موقع پر کچھ لکھنا چاہئے یا نہیں آپ میری اس
کمزوری کو معاف کریں مگر حقیقت یہ ہے کہ میں ان تحریروں کے ساتھ جو زیادہ تر میری تعریف میں ہوگی
خود اپنی تحریر شامل کرنا نہیں چاہتا "نوائے رضا" شائع ہوئی۔ "شہادت سے پہلے شہادت کے بعد" دو
مرتبہ شائع ہوئے۔ "غزل معلیٰ" کی اشاعت ہوئی مگر میں نے اسکو گوارا ہی نہیں کیا کہ دوسرے سے
اپنے متعلق کچھ یعنی (توصیفی کلمات) لکھوا کر یہ چیزیں شائع کروں صرف خود ہی اظہار واقعہ کے طور پر
اپنے کچھ خیالات لکھ دئیے وہ کتابیں میں نے خود ہی طبع کرائی تھیں یہ مرثیہ آپ لوگ چھپوا رہے ہیں آپ
کو پورا پورا اختیار ہے کہ جس طرح بھی چاہیں شائع کر دیں مگر اس کام میں مجھے شامل نہ کیجئے۔ آپ خود
اپنی تحریر میں میرا تعارف کرتے وقت اس تحریر کے مناسب حصوں کو استعمال کر سکتے ہیں جو "شہادت سے
پہلے شہادت کے بعد" میں میں نے اپنی مرثیہ گوئی اور اسکی مقبولیت کے متعلق لکھ دی ہے۔ جدید طرز

مرثیہ گوئی کے بارے میں آپ اسی تحریر کو مستند کیوں نہیں سمجھتے جو اس وقت میرے قلم سے نکلی جب اس رنگ کی ایجاد ہوئی تھی اور لوگ (کیسے کیسے لوگ) اور کتنے کثیر حضرات یہ سمجھتے تھے کہ آل رضا نے نہایت مفید اور مناسب رنگ اختیار کیا ہے اس وقت تو لوگ جمیل مظہری اور جوش کو بحیثیت مرثیہ نگار جانتے بھی نہ تھے۔ اب کچھ حضرات ان لوگوں کے نام بحیثیت موجد رنگ جدید بر بنائے بغض ہی اچھال رہے ہیں۔ کسی نے بابا آدم کے وقت سے اس رنگ میں کچھ کہا ہو لیکن سوال یہ ہے کہ جب میں نے اسے شروع کیا ہے اسوقت ان حضرات کے کلام کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ میری اس وقت کی تحریر کہیں زیادہ مستند ہے۔

میں نے اس میں سب کچھ لکھ دیا ہے کہ میں نے اس نئے رنگ کے لئے کیا کیا اور کیوں ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ اسے اس نگاہ سے ایک مرتبہ پڑھیں تو۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ آپ اس پوری تحریر کو مع اپنے تعارف اور تبصرے کے ساتھ اسی مطبوعے میں شامل کر دیتے کہ میں نے ۱۹۴۲ء میں کیا عرض کیا تھا اب تو ۱۹۶۶ء ختم ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ آپ ذرا میرے وہ دس بارہ بند بھی پھر سے پڑھ جایئے جو میں نے ''انیس اہل ادب ہے وقار منبر کا'' والے مرثیے میں عرض کئے ہیں اور یہ واضح کیا ہے کہ میں اس رنگ اور قدیم اساتذہ کے رنگ کے متعلق کیا سمجھتا ہوں اور ضرورت وقت کے لحاظ سے یہ روش کیوں اختیار کی ہے اب تو پرانے رنگ میں کہنے والے وہی چبائے ہوئے نوالوں کو نوش جاں فرما کر مونچھوں پر تاؤ دے رہے ہیں اب کیا! میر اور مرزا صاحبان اعلی اللہ مقامہ کے بعد غالباً دو نسلوں تک تو یہی حالت رہی۔

ایک بات اور عرض کر دوں۔ آپ اس مرثیے کے ساتھ میری مرثیہ گوئی کے متعلق گراں قدر تبصرہ نگاروں کے مرقومات شائع کیجئے انھیں دیکھ کر میں انشاء اللہ دوسرے مرثیے کے ساتھ چھپنے کے واسطے اپنی معروضات بھی پیش کرونگا۔ ابھی اپنے منہ میاں مٹھو بننا مجھے پسند نہیں ہے۔ اگر یہاں کے حضرات اپنی تحریروں سے میری قدر افزائی فرمائینگے تو پھر میرے لئے قلم اٹھانے کا کوئی موقع نکلے گا۔ اور اگر کچھ اعتراضات ہونگے تو ان کے مان لینے یا ان سے اختلاف کرنے کی معقول وجوہات پیش کرنے بھی مناسب محل ہوگا۔

جن شیعہ مولوی صاحب کو آپ لوگوں نے تبصرے کی زحمت دی ہے اگر وہ قران پاک کی

آیتیں اور حدیثیں جو کثیر تعداد میں نظم ہوئی ہیں واضح کر دیں تو بہت بہتر ہے میرے مرثیہ میں یہی تو خاص بات ہے۔ مثلاً پہلے ہی بند کو لے لیجئے چھ مصرعے اور سب آیات قرآنی کے حوالے سے۔ لکھنؤ کے علامہ جزائری وہاں موجود ہیں ان سے کہیے یا جن صاحب کا نام آپ کے یہاں موجود ہے مثلاً مولانا مرتضٰی حسین صاحب۔ عظمت انساں کا نام مناسب ہے ڈاکٹر صفدر حسین نے لکھا ہے کہ اس کتاب کا نام عزم حسین ہونا چاہیے کیونکہ اس مرثیے میں عظمت انساں اور عزم حسین دونوں کا بیان ہے۔ امید ہے آپ مع الخیر ہونگے۔

دعا گو۔

آل رضا "

تیرہواں مکتوب

(۱۴۔ جنوری ۱۹۶۷ء)

دوسرے مقالہ نگاروں کی طرح میں نے ڈاکٹر احسن فاروقی کو بھی "عظمت انساں" پر مقالہ لکھنے کی دعوت دی تھی۔ ڈاکٹر فاروقی مرحوم قدیم مرثیہ نگاری پر بڑی دقیق نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے انیس مرحوم پر متعدد اعتراضات کئے مثلاً۔ (۱)۔ کربلا میں گل بوٹے سایہ دار درخت اور درختوں پر تسبیح خواں طیور کہاں تھے۔ (۲)۔ جناب عباس جناب علی اکبر جناب قاسم کے معرکۂ جنگ کے انداز یکساں ہیں۔ (۳)۔ ہندی رسومات خانہ اہلبیتؑ میں دکھائی گئی ہیں۔

ان کے ان اعتراضات کے بڑے مدلل جوابات دیے گئے۔ انکی اسی دشمنی کی وجہ سے استاد محترم نے مجھ سے شکایت کی ہے۔ میرا خیال تھا ۴۴ء میں استاد محترم کا تحریر کردہ مقدمہ اس جدید دور میں شامل کتاب کرنا کچھ مفید نہ ہوگا کیونکہ زمانہ بدل گیا نیا دور آگیا تنقید کے جدید اصول کارفرما ہیں پرانی تحریری طرز تحریر سے مطابقت نہ رکھے گی مگر ان کا خیال تھا کہ ان کا ۲۳ سال پرانا مقدمہ اب بھی نیا ہے۔

انھوں نے مرثیوں کے مقدمے سے رباعیات اور غزل معلی کے مقدمے سے معرکۃ الارا کے

الفاظ کاٹ کر سکوتی اور معرکہ آرا بنا دیا۔ جب میں نے ڈاکٹر عابدی صاحب سے ان تبدیلیوں کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ جو لفظ سوز دہو کر جس طرح بولا جائے وہ درست ہوتا ہے رہائش اور معرکۃ الارا دونوں اردو الفاظ بن چکے ہیں لب سڑک اور فوق البھڑک اسکی بہترین مثالیں ہیں۔

میں نے تحریر کیا تھا کہ جن نئے اور پرانے شعرا نے سرقات کئے ہیں ان کی تفصیل مجھے بھی ارسال کر دیں خط میں ذکر ہے کہ مضمون تو مل گیا ہے مگر بغیر تحقیق وہ مجھے بھیجنا پسند نہیں کرتے۔

" کراچی۔

۱۴۔ جنوری ۱۹۶۷ء

مکرمی تسلیم۔ عید مبارک ہو۔ دلی دعائیں تحفۂ درویش ہیں میں نے اپنے بھائی مسعود رضا سلمہٗ سے آپ کا ذکر مرثیے کی طباعت کے سلسلے میں کیا تھا۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ آپ سے امور متعلقہ کے بارے میں لاہور میں بھی گفتگو کر لیں تو بہتر ہوگا۔ ڈاکٹر فاروقی صاحب کو آپ نے میرے مرثیے کے متعلق بیکار زحمت دینے کی کوشش کی۔ یہ حضرت ایک زمانہ میں انیس اعلیٰ اللہ مقامہٗ پر اعتراضات کر چکے ہیں۔ میں خود چاہونگا کہ وہ میرے متعلق کچھ نہ لکھیں۔ جوش صاحب اور اختر صاحب کو میں فون پر آپ کی شکایت سے مطلع کر دونگا۔ خود تو نہیں کہونگا کہ وہ براہ کرم زحمت فرمائیں اس معاملے میں میں کسی کا احسان لینا نہیں چاہتا۔ آپ مرثیے کا ایک مسودہ مجتبیٰ حسین جونپوری پروفیسر سراج الدولہ کالج کراچی کو روانہ کر دیجئے میں ان سے کہلوا دونگا میں ان کو اس کا اہل سمجھتا ہوں کہ میرے لکھے ہوئے مرثیے پر تبصرہ فرمائیں۔ غالباً وہ آپ کو مایوس نہ کرینگے۔ اصل مرثیہ اب مجھے واپس ہو جانا چاہئے۔ میں نے ڈاکٹر صفدر کو حال ہی میں لکھ دیا ہے کہ میں ان سے بے تعلق رہنا چاہتا ہوں اور بس اسی کے ساتھ میں اپنی طرف سے ان کا خیر اندیش ہوں۔

میں نے جو عرض حال ۴۳ء میں دو مرثیوں کے سلسلے میں لکھا تھا اسکا بہت سا حصہ اب بھی اس قابل ہے کہ آپ اپنے تبصرے میں شامل کر دیں۔ مسعود سلمہٗ سے اس معاملے میں مشورہ کر لیجئے۔ اس

عرض حال میں ایک جگہ میں نے رہائش کا لفظ استعمال کیا ہے جو باوجود مستعمل ہونے کے غلط ہے اسے آپ سکونت بنا لیجئے۔ میں نے اس مضمون میں صاف ظاہر کر دیا ہے کہ اس رنگ کو عام طور سے پہلے پہل پیش کرنے کے باوجود مجھے اپنے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ اور یہ بھی تفصیل سے لکھ دیا ہے کہ اس رنگ کے مخصوص اقدار کیا ہیں ۴۴ء کی کہی ہوئی بات ہے جواب تک اپنی جگہ پر قائم ہے۔ جس مضمون کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ میرے پاس آ گیا ہے مگر میں نے ان صاحب سے عرض کیا ہے کہ میں اپنے اطمینان کے لئے ان کے متعلقہ ماخذ بھی دیکھنا چاہتا ہوں جس کا انتظار ہے۔ غالباً مارچ میں بشرط حیات وصحت میں لاہور حاضر ہونگا۔ قمر سلمہٗ کی لڑکی کی شادی کے سلسلے میں۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ آپ نے احسان دانش سے تبصرہ کیوں نہیں لکھنے کے لئے کہا۔

دعا گو۔

آل رضا "

چودہواں مکتوب

(۲۵۔جنوری ۱۹۶۷ء)

میں نے اختر صاحب پرنسپل پبلک اسکول کراچی اور پروفیسر مجتبیٰ حسین صاحب کو مرثیے کے مسودے بھی ارسال کئے اور خطوط بھی لکھے ان حضرات نے نہ جانے کیوں یہ بیان دیا کہ لاہور سے کوئی تحریک نہیں ہوئی۔ حسن اختر صاحب کا ۹۔فروری ۱۹۶۷ء کا خط مجھے ۱۱۔فروری کو ملا جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں۔

آپ کا رجسٹری شدہ لفافہ ملا کھولا تو "اسلام دین عظمت انساں ہے دوستو" کا پیغام ملا میں نہ مرثیہ گو ہوں نہ نقاد ہاں موصوف کا عقیدت مند ہوں۔ میں ان کے کلام کو اردو ادب کا بیش قیمت خزانہ سمجھتا ہوں آپ نے مجھ سے کلام رضا پر تبصرہ کی خواہش کا اظہار کیا بڑا غضب کیا جس کام کی میرانیس اور مرزا دبیر نے ابتدا کی تھی موصوف نے بڑی سج دھج کے ساتھ اسکی تکمیل کر دی۔ والسلام

مخلص۔ حسن اختر۔

جس بارہ بند کا ذکر اس خط میں ہے وہ اس مرثیے کے ہیں جس کا مطلع درج ذیل ہے۔

ایسی اہل ادب ہے وقار منبر کا

جس میں کہا گیا ہے کہ میر و مرزا صاحبان کمال تھے لیکن اب ان کے رنگ میں مرثیہ کہنا مناسب نہیں اب جدید طور کے مرثیے کہنا چاہیے۔ پرانی ہڈیوں کو چبانے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔

" کراچی۔

۲۵۔ جنوری ۱۹۶۷ء

مکرمی تسلیم۔ آپ کے خطوط کے مطابق میں نے اختر صاحب اور مجتبیٰ صاحب سے گفتگو کی دونوں حضرات نے یہ بیان کیا کہ آپ حضرات کی جانب سے کوئی تحریک نہیں ہوئی اس صورت حال کے بعد جوش صاحب سے کیا دریافت کرتا۔

احتشام صاحب کا کوئی مقالہ کبھی میرے پاس نہیں آیا۔ میرے مطبوعہ مرثیوں کی کاپیاں اب تقریباً عنقا ہیں ایک کاپی آپ کے لئے تلاش کر کے رکھی تھی وہ حاضر کر دی تھی۔ اختر صاحب اور مجتبیٰ صاحب سے میں نے صاف عرض کر دیا کہ میری جانب سے کسی تبصرے کی استدعا نہیں ہے کیونکہ یہ میرے اصول کے خلاف ہے بہر حال وہ دونوں حضرات اپنے خیالات کے اظہار کے واسطے تیار ہیں بشرطیکہ آپ حضرات طلب کریں۔

اب تو شاید یہ ضروری ہو گیا ہے کہ آپ میرے رنگ کلام کو ظاہر کرنے کے لئے وہ دس بارہ بند بھی اپنے مقالے میں شائع کر دیں تا کہ لوگ حقیقت حال سے آگاہ ہو جائیں بہر حال آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں میرا کوئی اصرار نہیں ہے۔ مجھے اب وہ دونوں مرثیے درکار ہیں امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

منت کش۔

آل رضا "

پندرھواں مکتوب

(۹۔فروری ۱۹۶۷ء)

میں نے کہیں پہلے بھی تحریر کیا ہے کہ جناب حسن اختر صاحب پرنسپل حبیب پبلک اسکول نے مجھے انٹرویو کے لئے بلایا میں نے دو دن مختلف جماعتوں میں لیکچر دیئے انھوں نے عندیہ ظاہر کیا کہ وہ میرا تقرر اپنے مدرسے کے لئے موزوں سمجھتے ہیں مگر جو مشاہرہ بتایا وہ کراچی جیسے شہر کے لئے بالکل ناکافی تھا اس لئے میں لاہور آ گیا۔

میں نے پروفیسر مجتبیٰ صاحب سے مقالہ لکھنے کی درخواست کی تھی انھوں نے کچھ دنوں بعد اپنا وعدہ وفا کر دیا۔

کتاب کے پروپیگنڈے کے لئے بہت سے ملکی جریدوں میں اشتہار دیئے گئے استاد محترم کی رائے تھی کہ اشتہار میں جوش اور دیگر مقالہ نگاروں کے فقرے بھی ہوں۔ مگر یہ بات مشکل تھی کیوں کہ جتنا بڑا اشتہار اتنی ہی بڑی اسکی قیمت ادا کرنا ضروری تھا۔

"فردوس کالونی کراچی۔

۹۔فروری ۱۹۶۷ء

محتری تسلیم

آپ کے گرامی نامے کا جواب دے چکا ہوں۔ جس میں جوش صاحب کے کچھ تاثرات ملفوف ہیں یہ بھی لکھتا ہوں کہ اختر صاحب نے مجھ سے یہاں کہا تھا کہ وہ کچھ لکھ کر آپ کے پاس بھیج چکے ہیں آج مجتبیٰ صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ مضمون تقریباً تیار ہے آپ ان سے براہ راست طلب کرلیں اور جو کچھ انھوں نے اطلاع دی ہے ان کا شکریہ ادا کریں۔

آپ ابھی تک مسعود سلمان سے نہیں ملے۔ وہ پرسوں یہاں سے لاہور واپس جائینگے۔ فضل صاحب سے میں نے عرض کر دیا ہے کہ وہ آپ سے دونوں مرحمے لے کر میرے پاس بھجوادیں یہاں وقتاً

فوقتاً ضرورت پڑتی ہے۔

غالباً آپ کے مطبوعہ کے خیر مقدم کے سلسلے میں یہ بہتر ہو کہ "عظمت انساں" کے اشتہار میں جوش صاحب کے کچھ الفاظ لکھ دیں بلکہ کچھ اور حضرات کے بعض فقرے بھی۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

نیاز کیش۔

آل رضا "

سولہواں مکتوب

(۱۰۔فروری ۱۹۶۷ء)

جناب مجتبیٰ صاحب اور حسن اختر صاحب دونوں کو میرے خطوط مل گئے تھے حسن اختر صاحب نے تو معذرت کر لی البتہ مجتبیٰ صاحب نے فروری کے آخر میں اپنا مقالہ بھیجنے کا وعدہ کیا۔ میں نے جوش صاحب کو بھی مسودہ ارسال کر دیا تھا ادھر کراچی سے استاد محترم نے بھی دو مرثیے بھیج دیئے تھے۔ لیکن جوش صاحب نے آل رضا کی مرثیہ گوئی پر ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ اس بات کا میں نے استاد محترم سے شکوہ کیا تو انھوں نے جواباً تحریر کیا کہ جوش صاحب نے جو کچھ لکھا بہت ہے وہ کوئی تبصرہ نگار نہیں ہیں۔

" کراچی۔

۱۰۔فروری ۱۹۶۷ء

محترمی تسلیم۔ پوسٹ کارڈ کل پہنچا نہ معلوم کب روانہ ہوا تھا۔ ریلوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا ہے غالباً اب ڈاک میں غیر معمولی تاخیر نہ ہوگی۔

مجھے اپنے متعلق دوسروں سے کچھ کہتے ہوئے تامل ہوتا ہے بہر حال آپ کے پبلشر صاحب کے خیال سے میں نے جوش صاحب کو ٹیلیفون کیا انھوں نے بالآخر کہا کہ مسودہ میرے پاس آجائے اور

دو تین مرثیے اور تو میں سب کام چھوڑ کر مضمون لکھ ڈالوں۔ اگر آپ نے مرا اصل مرثیہ واپس کر دیا ہوتا تو میں وہی بھجوا دیتا۔ دو پرانے مطبوعہ مرثیے بھجوا دیے ہیں آپ مسودہ بھیج دیں۔ مجتبیٰ صاحب نے کہا ہے کہ جواب بھیج چکا ہوں کہ آخر فروری تک یہ کام کر سکونگا۔ کیونکہ اس زمانے میں امتحانات کی کاپیاں دیکھنے میں تمام وقت گزر جاتا ہے اب آپ جو مناسب سمجھیں لکھ دیں۔ اختر صاحب کو کئی مرتبہ ٹیلی فون کیا کسی نے اٹھایا ہی نہیں انھوں نے مجھ سے کہا تھا (جس کو ایک عرصہ ہو گیا) کہ میرے پاس کوئی خط مسودہ نہیں آیا ورنہ ضرور تعمیل کرتا اب میں خود ہاشمی صاحب کو لکھونگا۔ خدا جانے اس کے بعد کیا ہوا۔

خدا کرے ہر سال ہر نوخیز مجھ سے بہتر مرثیہ پیش کرے۔ اور میری دلی تمنا پوری ہو سرکار حسینؑ میں نذرانہ عقیدت کی جس قدر بہتات ہو میرے لئے موجب طمانیت ہے۔ امید کہ آپ مع الخیر ہونگے۔

دُعا گو۔

آل رضا ؔ

سترہواں مکتوب

(۲۳۔ فروری ۱۹۶۷ء)

۱۹۶۶ء میں چند دنوں کے لئے میں کراچی گیا تو ایک دن استاد محترم سے بھی ملنے گیا۔ کتاب "عظمت انساں" کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ جوش صاحب آل رضا صاحب سے ملنے آگئے۔ مجھ سے استاد محترم نے کہا کہ آپ جوش صاحب سے درخواست کریں کہ وہ بھی اس کتاب کی تحریروں میں شامل ہو جائیں۔ میں نے جوش صاحب کو صورت حال بتائی اور سید آل رضا کی مرثیہ گوئی پر ایک مضمون لکھنے کی استدعا کی۔ جوش صاحب نے کہا ضرور ضرور اور خاموش ہو گئے۔ استاد محترم چارپائی پر اور ہم دونوں سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ جوش صاحب نے مجھ سے دیگر مقالہ نگاروں کے اسمائے گرامی پوچھے میں نے چند مشاہیر کے نام بتا دیئے جوش صاحب اور آل رضا صاحب گفتگو میں منہمک تھے کہ راجا صاحب محمود آباد آگئے ان کے لئے ایک اور کرسی کا انتظام

ہوا اور وہ بھی میرے داہنے طرف بیٹھ گئے۔ دس منٹ تک جدید مرثیہ نگاری پر باتیں ہوتی رہیں اور آل رضا صاحب ہی تشریح کرتے رہے یکا یک آل رضا صاحب نے منہ سے چائے کا لفظ نکالا اور پاؤں نیچے کر کے جوتی تلاش کرنے لگے تو کراری نے جھاڑو دیتے ہوئے جوتی قدرے اندر کر دی تھی دونوں حضرات نے چائے پینے سے انکار کیا مگر استاد محترم نے کہا بھائی ہاشمی صاحب لاہور سے آئے ہیں آپ حضرات انھیں چائے سے کیوں محروم کر رہے ہیں یہ کہہ کر پھر جوتی ڈھونڈنے لگے میں ان کا شاگرد بھی تھا اور اس محفل میں خرد بھی اس لئے میں جونہی کرسی سے اٹھا اور جوتی نکالنے کے لئے آگے بڑھا جوش صاحب نے فوراً جوتی نکال کر آل رضا صاحب کے سامنے رکھ دی آل رضا صاحب چلا چلا کر منع کرتے رہے مگر جوش صاحب یہ سعادت حاصل کر چکے تھے پھر دونوں حضرات اٹھے اور رخصت لے کر مجھے حیران کر کے چلے گئے۔ یہ جوش کا عمل تھا اب ان کا درج ذیل قول بھی سن لیجئے۔ "مجھ کو اس بات کا یقین ہے کہ آج سے ایک ہزار برس کے بعد بھی جب صحیح مرثیوں کا ذکر چھڑے گا تو لوگ انگلیاں اٹھا اٹھا کر کہیں گے دیکھو یہ آل رضا کا وہ ستارہ تجلی ہے جس نے ہم کو راستہ دکھلایا یہ ہمارا ہادی ہمارا پیشوا اور یہ ہمارا امیر کارواں ہے"۔ (جدید فن مرثیہ نگاری ص ۹)۔ میں نے استاد محترم کو جوش کی اصلی تحریر اور دو مرثیے واپس کر دئے انھیں یہ علم نہ تھا کہ ابھی لاہور میں فوٹو اسٹیٹ کی مشین عام نہ تھی۔ کاتب بھی بڑا ست الوجود تھا اس لئے تعمیل حکم میں دیر لگی۔ مسعود رضا صاحب جوش کا خط پڑھ کر بے حد خوش ہوئے۔

" کراچی۔

۲۲۔ فروری ۱۹۶۷ء

مکرمی وحید الحسن صاحب تسلیم

جوش صاحب کی تحریر روانہ کرتا ہوں۔ مگر خدا کے لئے اسے فوراً واپس کر دیجئے ان مرثیوں کی طرح اسے ڈال نہ رکھئے گا اس کی نقل کر کے پریس میں دے دیجئے اور اصل بہ واپسی ڈاک مجھے بھیج دیجئے۔ اور بغور عنایت اب وہ مرثیے بھی واپس کر دیجئے جو آپ کے لئے بیکار ہیں اور ان کے بغیر بعض موقعوں پر ایسا ہرج ہو جاتا ہے کہ کیا کہوں یہاں میرے مرثیے کس کس طرح سے نہایت شوق کے ساتھ

استعمال ہوتے ہیں کیا کہوں۔ بس اسے عطیہ سرکار حسینی ہی سمجھ لیجئے ۔ ورنہ میرا کلام اس قابل کہاں میرے پاس ان مرثیوں کی نقلیں نہیں ہیں میں جو ان سے کام نکالوں۔ میں نے آپ کی سہولت کے لئے یہ بھی تجویز کیا تھا کہ لفافے میں محفوظ کر کے سجاد سلمہ یا قمر سلمہ کے پاس پہنچا دیں۔ قمر میاں کا پتہ پولیس والوں سے بآسانی مل سکتا ہے اور کسی ESSO کے پٹرول پمپ سے سجاد کے گھر یا آفس کا پتہ چل سکتا ہے۔

خدا جانے آپ میری یہ التجا کیوں قبول نہیں کرتے ۔ ایک مرثیہ چھپ ہی گیا دوسرا مرثیہ اگر چھاپنے کا قصد بھی ہو تو اس وقت تک اس کی سیکڑوں نقلیں ہو سکتی تھیں۔ آپ نے کہا تھا کہ آٹھ دن میں نقل ہو جائیگی ۔ اب تو کئی مہینے ہو گئے ۔ کسی وجہ سے اگر آپ جوش کی تحریر اپنے پاس رکھنا چاہیں تو اسکی فوٹو کھنچوا لیں مگر ان کے قلم کی تحریر میرے پاس رہنا چاہیے۔

اختر صاحب ملے تھے وہ کہتے تھے کہ وہ کچھ لکھ کر آپ کے پاس بھیج چکے ہیں۔ مجتبیٰ جونپوری کے بارے میں آپ کو لکھ چکا ہوں۔ آخر فروری کا وعدہ کیا تھا آپ اگر ان کی تحریر چاہتے ہوں تو یاد دہانی کر کے طلب کیجئے ۔ میں نے تو حکم کی تعمیل کر دی ۔ رنگ کلام کے متعلق جوش نے جو لکھ دیا کوئی کیا لکھے گا مگر مرثیے پر تبصرے کے لحاظ سے مجتبیٰ صاحب کی تحریر غالباً زیادہ مفید اور درس آموز ہو گی ۔ کم سے کم مجھے یہی توقع ہے۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہونگے میری طبیعت اچھی نہیں رہتی مگر مالک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ چلتا پھرتا رہتا ہوں۔ جوش کی یہ تحریر مسعود سلمہ کو بھی دکھلا دیجئے گا ۔ وہ بہت خوش ہونگے۔

منت کش۔

آل رضا "

اٹھارہواں مکتوب

(۳۔ مارچ ۱۹۶۷ء)

میں نے اپنے خط میں تحریر کیا تھا کہ جوش صاحب کی مختصر تحریر مل گئی ہے مگر اس میں آپ کے مرثیہ "عظمت انساں" پر کوئی تبصرہ نہیں جب کہ اس کتاب میں آپ کے مرثیے پر تبصرے اور

تنقید شائع کی جا رہی ہے اس خط میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مجتبیٰ صاحب میرے ہم وطن اور میرے کرم فرما تھے وہ مجھ سے بیحد محبت کرتے تھے کچھ سید آل رضا صاحب کی شخصیت کا اثر تھا اور کچھ میری دل شکنی کا خوف تھا کہ انھوں نے بہترین مضمون سپرد قلم کیا۔

کتاب کے پرنٹر ابرار شیرازی مرحوم مجھ سے بار بار کہتے تھے کہ کتاب پر اخراجات بڑھ رہے ہیں اور آمدنی کی کوئی صورت نہیں اس لئے اس کے حجم کو کم کروں میں نے کئی مضامین نہیں شائع کئے۔ دوسرے مقالہ نگاروں کی میٹھی اور کڑوی تحریروں کو تو میں حذف نہیں کر سکتا تھا خود اپنے مضمون کو کاٹ کر مختصر کر دیا۔

میں استاد محترم کے مرثیوں کے ایک ایک لفظ کے معنی اور اسکی وسعت و مرتبت سے واقف ہوں مگر پرنٹر کا خسارہ پورا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے جیسے اور جو کچھ ہو سکا کیا گیا۔ کاش کہیں سے امداد مل جاتی تو کتابت کاغذ کتاب کا سائز اور جلد اس سے کہیں بہتر صورت میں سامنے آتی۔ پرنٹر کی نگاہ کتاب کے مواد پر نہیں ہوتی بلکہ اس آمدنی پر ہوتی ہے جو اخراجات کو وضع کرنے کے بعد اسکی جیب میں جاتی ہے۔

کراچی۔

۳۔ مارچ ۱۹۶۷ء

عزیزی ہاشمی صاحب تسلیم

کل پوسٹ کارڈ موصول ہوا۔ اس سے پہلے میں نے برادرم فضل حسین صاحب کے ہاتھ ایک لفافہ ارسال کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ جوش صاحب کی تحریر آپ کو پسند نہیں آئی۔ آج مجتبیٰ صاحب نے جو مضمون بھیجا وہ ارسال کر رہا ہوں۔ مجتبیٰ صاحب نے جدید رنگ مرثیہ گوئی خصوصاً میرے رنگ پر تبصرہ کیا ہے۔ جوش صاحب نے یہ ظاہر کر کے کہ یہ رنگ صحیح قسم کی چیز ہے اور اس میں ان کے نزدیک میرا درجہ کیا ہے بڑی کشادہ دلی سے بہت کچھ لکھ دیا ہے۔ تبصرہ واقعی نہیں ہے اور نہ میں انھیں تبصرہ نگار سمجھتا ہوں نہ خود ان کے رنگ میں مرثیت کا دخل ہے لہٰذا وہ مرثیے پر کیا لکھتے۔ بہر حال میں ان کا ممنون ہوں

اور اس کا اور زیادہ کہ جب میں نے فون پر ان کا شکریہ ادا کیا تو انھوں نے بااصرار کہا "میں نے مبالغہ نہیں کیا۔ میں نے مبالغہ نہیں کیا" آج تک کے رنگ تبصرہ کے لحاظ سے ایک حد تک مجتبیٰ صاحب کا مضمون اچھا ہے بعض پہلو رہ گئے ہیں مگر غالباً ان کے پاس زیادہ وقت نہ تھا۔

آخر اور لوگ بھی تو لکھیں گے کاش کہ میں نے آپ سے مرثیے کے متعلق گفتگو کر لی ہوتی تو شاید آپ کا تبصرہ اور پُر مغز ہوتا۔ میری تعریف میں نہیں بلکہ ان پہلوؤں پر روشنی ڈالنے میں جس کی طرف میں نے توجہ کی ہے اور دوسروں کو توجہ دلائی ہے۔ میں سب باتیں کہاں تک لکھ سکتا ہوں آپ خود ہی اپنی پسند کو ترجیح دیں۔

زینب کھڑی ہیں بار امانت لئے ہوئے   بچوں کو رو کے بھائی کو رخصت کئے ہوئے

فضہ پکاری اے مری بی بی یہ کیا ہوا

ایسے مقامات ہیں جو کامیاب تبصرہ نگار کی فکر چاہتے ہیں۔ اے مری بی بی یعنی اس وقت جناب سیدہ کا نام نہ لے کر ان سے ان کے کنبے کی مخاطبت عجیب نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ کرتی ہے میرے لاہور آنے کے متعلق یوں سمجھ لیجئے کہ غالباً قمر سلمہ اب اس شادی کا انتظام ربیع الاول میں کر سکیں گے۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

دعا گو۔

آل رضا "

انیسواں مکتوب

(۱۶۔ مارچ ۱۹۶۷ء)

کتاب "عظمت انساں" کی اشاعت کے سلسلے میں جو مضامین میرے پاس آتے تھے میں ان کے ضروری اقتباسات استاد محترم کو روانہ کر دیتا تھا مولانا مرتضیٰ حسین صاحب اور سہیل بناری صاحب کے مضامین کے اقتباسات انہیں ارسال کیے جنہیں پڑھ کر وہ مطمئن ہو گئے۔

بیگم فضل حسین کے ذریعے سے مجتبیٰ صاحب کا مضمون بھی مل گیا تھا۔ مگر وہ لفافہ نہ ملا جس میں کسی مضمون کے اقتباسات تھے۔

میں نے استاد محترم کو لکھا تھا کہ مجتبیٰ صاحب میرے عزیز اور ہم وطن ہیں ان سے میں مضمون حاصل کر لوں گا مگر دوسرے مقالہ نگار میرے کہنے سے مضامین ارسال نہ کریں گے۔ میں نے پروفیسر کرار صاحب، نسیم امروہوی صاحب اور سہیل بخاری صاحب کو بھی خطوط کے ساتھ مسودے ارسال کیے تھے مگر یہ تمام حضرات میرے خطوط پی گئے۔ اگر آل رضا صاحب ذرا سی بھی کوشش کرتے تو یہ حضرات کچھ نہ کچھ ضرور لکھ دیتے۔ مگر افسوس ہے کہ استاد محترم نے اس سلسلے میں میری مدد نہ کی۔

فردوس کالونی کراچی۔

۱۶۔ مارچ ۱۹۶۷ء

عزیز گرامی قدر تسلیم و دعا

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ آج سہ پہر کو آپ کا محبت نامہ مورخہ ۱۰۔ مارچ ملا جس میں مولانا مرتضیٰ حسین صاحب کے تبصرے کے کچھ اجزا مرقوم ہیں اس سے پہلے خط میں جناب سہیل صاحب کے رشحات قلم کا نمونہ موصول ہوا تھا میں نے دونوں تبصروں سے اپنے مزاج کی ہم آہنگی محسوس کر کے طمانیت خاطر حاصل کی۔ آپ کے سب خطوط مجھے تو مل رہے ہیں مگر نہایت افسوس ہے کہ میری تحریریں آپ تک نہیں پہنچتیں۔

تقریباً بارہ دن کا عرصہ ہوا کہ بیگم فضل حسین (۱۳۔ لیک روڈ لاہور) کے ہاتھ ایک لفافہ مع اپنی تحریر کے ارسال کیا تھا۔ اس کے بعد احتیاطاً ایک خط ڈاک سے آپ کے نام براہ راست روانہ کیا تاکہ اگر بیگم صاحبہ کی جانب سے کوئی تساہل ہو تو آپ خود جا کر وہ لفافہ وصول کر لیں۔ اب یہ دونوں تحریریں غائب ہیں۔ ایک اور لفافہ آپ کے نام بذریعہ ڈاک بھیجا جس میں طویل مضمون کے ضروری اقتباسات تھے لیجیے وہ خط بھی غائب ہو گیا۔ خیر اس کا تو اعادہ کیا جا سکتا ہے مگر پھر محنت کرنا پڑے گی۔ مگر

مجتبیٰ صاحب کے مضمون کے بارے میں کیا کہا جائے فوراً جواب سے مطلع فرمائیں۔ اسی سلسلے میں میں آپ کو کچھ اور بھی لکھنے والا تھا مگر اس وقت دماغ معطل ہے۔

خدا حافظ۔ دُعا گو۔

آل رضا "

بیسواں مکتوب

(۲۶۔ مارچ ۱۹۶۷ء)

استاد محترم کا لفافہ تو مجھے نہ ملا البتہ راحت صاحب کا ایک رجسٹرڈ خط ملا جس میں قدیم اور جدید شعرا کے سرقات کے حوالے درج تھے میں چونکہ مرثیہ نگاروں کو سر بازار رسوا کرنے کا مخالف ہوں اس لئے وہ سارا مسالہ میرے کسی کام کا نہیں۔ سرقات بھی ان شعرا کے ہیں جو انتقال کر چکے ہیں اور اب جواب دینے کے بھی قابل نہیں ہیں ان مرحومین کے عیوب نکالنا جو اپنا دفاع نہیں کر سکتے مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مجھ سے کہا جاتا ہے کہ یہ ادبی مسئلہ ہے مگر مزہ تو جب ہے کہ وہ زندہ ہوتے اور اپنے دفاع میں دلائل دیتے۔ اب جبکہ وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں یک طرفہ کاروائی انصاف کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔

احتشام صاحب نے میرے خط کا کوئی جواب نہ دیا اس لئے میں نے استاد محترم کو لکھا تھا کہ اگر ان کا آپ کے بارے میں کوئی پرانا مضمون ہو تو روانہ کر دیں مگر افسوس کہ ان کے پاس بھی احتشام صاحب کا کوئی مضمون نہ نکلا۔

" فردوس کالونی کراچی۔

۲۶۔ مارچ ۱۹۶۷ء

معزز گرامی قدر تسلیم و دُعا۔ محبت نامہ مورخہ ۲۳۔ مارچ آج ہی موصول ہوا اس سے پہلے بھی ایک یا دو خط ملے جن سے معلوم ہوا کہ مجتبیٰ صاحب کا مضمون بعد از خرابی بسیار آپ تک پہنچ گیا مجھے آپ

کے اس خط کا انتظار تھا کہ شاید اس لفافے کے پہنچ جانے کی اطلاع مل جائے جس میں میں نے راحت حسین صاحب کے تبصرے کے کچھ اقتباسات تحریر کئے تھے میں نے اس مضمون کے بعض اجزا کو کم وزن سمجھ کر نکال ڈالا تھا اس وجہ سے پھر سے مناسب اعتراضات کی خود نقل کرنا پڑی تھی اب یہ زحمت پھر کرنا پڑے گی میں اس موضوع پر اپنا زیادہ وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا راحت حسین صاحب سے میں نے آپ کی فرمائش کی تعمیل کے لئے کہا اور انھوں نے جلدی میں سب کچھ مواد جمع کر کے مجھے دے دیا۔ نہایت افسوس ہے کہ میرا متعلقہ لفافہ آپ کو نہیں ملا جس کو میں نے ایک شخص کے ہاتھ مخصوص طریقے پر ڈاک خانہ بھیجا تھا۔ کہ صحیح طور پر ڈبے میں ڈال دے اور مجھے اطلاع دے۔ اس احتیاط کا نتیجہ برعکس ہوا خیر وہ زحمت پھر سے گوارا کرنا پڑے گی۔

جن تبصرہ نگار حضرات کے اقتباسات آپ نے میرے پاس بھیجے ہیں وہ میرے لئے طمانیت بخش ہیں خصوصاً اس وجہ سے کہ کچھ باتیں ان اہل قلم و فکر نے خود دریافت کر کے لکھی ہیں۔ احتشام صاحب کا کوئی پرانا مضمون میرے پاس نہیں ہے جس کی اطلاع آپ کو دے چکا ہوں۔

میں اس طرف لاہور جانے کا خیال ترک کر چکا ہوں غالباً یہی وہ سوالات ہیں جو آپ نے مجھ سے کئے تھے اور میں سب کے جواب دے چکا ہوں۔ غالباً وہ خطوط بھی راستے ہی میں غائب ہو گئے۔ مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ اب آپ اپنے جمع کردہ مضامین سے مطمئن ہیں مجھے اپنے اصلی مرثیوں کا سخت انتظار ہے۔ میرے داماد سید کوثر حسین زیدی لاہور جا رہے تھے ان سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ آپ سے مرثیہ لے لیں۔ عشرۂ محرم قریب ہے مجھے کئی جگہ مجلس پڑھنا ہوتی ہیں جن کے لئے ان مرثیوں کی شدید ضرورت ہوگی کوثر میاں منگل تک واپس آ جائیں گے۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ میری صحت اس زمانے میں اکثر خراب رہتی ہے پھر بھی اپنے مالک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ چلتا پھرتا ہوں۔

خدا حافظ منت کش۔

آل رضا ''

اکیسواں مکتوب

(۲۷۔ مارچ ۱۹۶۷ء)

جناب راحت صاحب سے میں استاد محترم کے یہاں مل چکا تھا انھوں نے میری درخواست پر کتاب ''عظمت انساں'' کے لئے ایک مضمون تحریر کر کے مجھے ارسال کیا تھا جسے میں نے کتاب میں شامل بھی کر لیا تھا۔

ایک دن احباب کے جمگھٹے میں مرثیہ نگاری کا ذکر ہو رہا تھا تو پروفیسر ظفر جونپوری نے رضویہ سوسائٹی میں ایک مرثیہ گو کا تذکرہ کیا جس نے اپنے نو تصنیف مرثیے میں ایک قدیم مرثیہ گو کے بند کے بند شامل کر دئے جب وہ منبر سے ایک مصرع پڑھتا تھا تو نیچے سے راحت صاحب دوسرا مصرع پڑھ دیتے تھے تھوڑی دیر کے بعد جب وہ بیت کا پہلا مصرع پڑھتا تھا تو راحت صاحب بیت کا دوسرا مصرع پڑھ دیتے تھے مجلس میں یہ بیت بازی کا کھیل اختتام مجلس تک جاری رہا بعد میں نو تصنیف مرثیہ پڑھنے والے نے اقرار جرم کر لیا۔ اسی واقعے سے راحت صاحب کی یادداشت کی داد دینا پڑتی ہے۔

لاہور آ کر میں نے سید آل رضا صاحب کو خط لکھا کہ میری طرف سے راحت صاحب سے درخواست کر دیجئے کہ وہ ان مرثیوں کی نشاندہی کر کے مجھے بھیج دیں جن میں دوسرے مرثیوں سے مصرعے اشعار یا بند شامل کر لئے گئے ہیں استاد محترم نے راحت صاحب سے میری طرف سے درخواست کی اور موصوف نے سرقات کا ایک پلندہ مجھے بھیج دیا۔ اگر سرقے کی کوئی سزا مقرر ہے تو وہ دربار سید الشہدا سے ملے گی میں کسی ذاکر امام حسین کا نامۂ اعمال طشت از بام کرنا اچھا نہیں سمجھتا۔

''۱۲۔ کورٹ چیمبرز۔ کراچی۔

۲۷۔ مارچ ۱۹۶۷ء

محترمی مکرمی تسلیم و دعا

کل ایک پوسٹ کارڈ لکھ چکا ہوں آج خیال آیا کہ مسعود سلمہ لاہور جارہے ہیں انہی کے ہاتھ یہ تحریر کیوں نہ روانہ کردوں تا کہ پہنچنے کے متعلق اطمینان رہے۔

میں پھر اس تحریر کے اقتباسات ملفوف کررہا ہوں جو راحت حسین صاحب نے آپ کی فرمائش کے سلسلے میں لکھ کر میرے حوالے کردی تھی۔ راحت حسین صاحب خود شاعر نہیں ہیں لہٰذا اپنے دماغ سے یہ باتیں پیدا نہیں کرتے صرف مرثیہ پڑھنے اور جمع کرنے کے شوقین ہیں۔ اس شغل کے باوجود میرے علم اور تجربے میں وہ شاعری سے خاصے بے تعلق ہیں اس سے زیادہ اور کیا کہوں۔ بعض اوقات بحروں میں تمیز کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یادداشت اچھی ہے اور مطالعہ وافر۔

جتنی باتیں انھوں نے پیش کی ہیں وہ صرف ایک فرد کی یادداشت کا نتیجہ ہیں۔

میری اس تحریر کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ میں کسی کو اعتراض کرنے پر آمادہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے صرف آپ کی فرمائش کی تعمیل یوں کردی کہ راحت صاحب کو اس کام پر آمادہ کردیا۔ میں اگر لکھنے بیٹھوں تو خدا جانے کیا کیا لکھوں مگر میں اس سے بچنا چاہتا ہوں۔ امید کہ آپ مع الخیر ہونگے۔

خیر اندیش۔

آل رضا"

بائیسواں مکتوب

(۳۰۔ مارچ ۱۹۶۷ء)

جناب پروفیسر خلیل صدیقی صاحب نے اپنے مضمون میں یہ جملہ تحریر کیا تھا۔

"ایک مخصوص فلسفہ مذہب' اخلاق اور انسانی عظمت کی وجہ سے مرثیہ موضوعاتی اعتبار سے ایپک سے بہت قریب آجاتا ہے۔ اگر مرثیہ گو (آل رضا) نے ان موضوعات کی پیش کش کے لئے واقعات کربلا کے مربوط اور مسلسل بیان کو ذریعہ بنایا ہوتا تو اردو میں ایک اعلیٰ درجے کی ایپک وجود میں آجاتی"۔ میں اس جملے کے نقص کو سمجھتا تھا مگر میں نے پروفیسر صاحب سے بحث

میں الجھا مناسب نہ سمجھا صدیقی صاحب کے سامنے استاد محترم کا سارا کلام نہ تھا وہ اسی ایک مرثیے میں تمام واقعات کربلا کا تذکرہ دیکھنا چاہتے تھے جس طرح فردوسی یا حفیظ جالندھری نے اپنی اپنی مثنویوں میں پیش کیا ہے۔ اسکے علاوہ صدیقی صاحب کو جدید مرثیہ نگاری کے اسرار و رموز سے بھی کماحقہٗ آگاہی نہ تھی اس لئے یہ جملہ استاد مرحوم کو بھی ناگوار گزرا۔ جدید مرثیہ واقعات و روایات سے گریز کر کے اشارات و کنایات کا سہارا لیتا ہے اس لئے اس میں ایپک کی جملہ خصوصیات کو تلاش کرنا بے سود ہے۔ یہ درست ہے کہ اگر وہ مرثیہ گو کی جگہ مرثیہ گویوں استعمال کرتے تو بات بن جاتی۔

" کراچی۔

۳۰۔ مارچ ۱۹۶۷ء

عزیز محترم۔ تسلیم۔ گرامی نامہ مورخہ ۲۸۔ مارچ موصول ہوا۔ ایک مرثیہ بھی پہنچ گیا دوسرا مرثیہ نہ آنے کا افسوس ہے۔ میں نے کئی مرتبہ عرض کیا کہ دوسرا مرثیہ بھی بھیج دیں۔ محرم سر پر ہے۔ مجھے اس مرثیے کی سخت ضرورت ہے اگر آپ پھر اسکی ضرورت محسوس کرینگے تو پھر آپ کی خدمت میں روانہ کردونگا۔ آپ جب وہ مرثیہ لے گئے تھے جس کو کئی مہینے ہو گئے تو آپ نے کہا تھا کہ ایک ہفتے میں نقل کرلی جائے گی۔ پھر آپ دوسرے مرثیے کی جانب متوجہ ہو گئے۔ بہرحال اب تو بھیج دیں۔

خلیل صدیقی صاحب کے تبصرے کا اقتباس پڑھا میں تو اپنے لکھے ہوئے مرثیوں میں واقعات کربلا کے مربوط اور مسلسل بیانوں کو ذریعہ بناتا رہتا ہوں جس کی طرف صدیقی صاحب نے اشارہ کیا ہے مگر سب واقعات کربلا ایک مرثیے میں پیش نہیں کئے جاسکتے۔ صدیقی صاحب میرے دوسرے مرثیوں سے واقف نہیں ہیں اسی لئے انھوں نے میرے یہاں اس کمی کو محسوس کیا ان کی اس عبارت میں اگر مرثیہ گو کی جگہ مرثیہ گویوں کا فقرہ لکھا ہوتا تو میرے نزدیک بہتر ہوتا۔ اس ترمیم پر آپ بھی غور کیجئے گا اور اگر ضرورت سمجھئے تو خود انھیں سے پوچھ لیجئے۔ مرثیے میں صرف ایپک والا ہی عنصر نہیں ہوتا اس کے بہت سے پہلو ہیں جو میرے خیال میں زیادہ اہم ہیں خصوصاً تقاضائے وقت کے لحاظ سے

میدان جنگ وقتی میدان فکر دائم

زیر طبع مرثیے کے انتظامات جو آپ کر رہے ہیں بہت مناسب ہیں خدا کرے آپ کی یہ سعی مشکور ہو۔ میں آج شب میں بہاولپور جا رہا ہوں وہاں میرے ایک ایسے کرم فرما ہیں جن کے اصرار نے وہاں کے مشاعرے کی شرکت پر مجبور کر دیا۔

خدا حافظ دُعا گو۔

آل رضا "

تنیسواں مکتوب

(۱۱۔اپریل ۱۹۶۷ء)

جناب سہیل کا تعلق شہر بنارس سے تھا اور مولانا جواد بنارسی سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ عربی فارسی کے علاوہ وکالت کی ڈگری بھی رکھتے تھے۔ "زنجیر جمال" ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے اس کے علاوہ منقبت سلام اور مرثیے بھی کہے۔ ۱۹۴۷ء میں لاہور آ گئے اور امپرو ومنٹ ٹرسٹ کے محکمے میں لیگل ایڈوائزر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۹۲ء تک ان کے چھ مجموعے شائع ہوئے نقوش عرفاں ان کا پانچواں دیوان ہے جسے میں نے استاد محترم کے پاس تنقید و تبصرہ کے لئے ارسال کیا۔

استاد محترم کا ایک مرثیہ "تھا جہاں پھر وہیں قرآن کو لے آئے حسین" ادارہ تنظیم الاسلام شائع کرنا چاہتا تھا اس لئے ان سے منگا کر میں نے ادارے کے سپرد کر دیا تھا۔ اسکی اشاعت میں تاخیر کا سبب ڈاکٹر خاکی مرحوم کا دیر سے مقدمہ لکھنا تھا۔

" کراچی۔

۱۱۔اپریل ۱۹۶۷ء

عزیز محترم تسلیم

"نقوش عرفاں" کا شکریہ حسب الحکم کچھ معروضات فوراً قلمبند کر کے ملفوف کر رہا ہوں سہیل صاحب کی طبیعت کو اس صنف شاعری سے خصوصی لگاؤ معلوم ہوتا ہے خوب خوب فرمایا ہے اور زیادہ تر اچھا کہا ہے۔

کہیں کہیں پر فارسی الفاظ کی یائے اصلی بے دھڑک گرائی ہے غالباً وہ اس کا لحاظ کرنا ضروری نہیں سمجھتے جس کی پابندی ہماری طرف عرصے سے کی جا رہی ہے۔ کچھ ایسے مصرعے بھی ہیں صفحہ ۲۸ مدح امام حسینؑ۔

بہت آگے ہے منزل تیری ہر ہادی و رہبر سے
سوا تیرے ہے نفس مطمئنہ کون عالم میں

میں خود اس قسم کی شاعری کو حفظ مراتب کی احتیاط کے منافی سمجھتا ہوں آپ بھی اس کا لحاظ رکھیں گے تو خوش ہونگا۔

"عظمت انساں" کی ترتیب اور انتظامات میں آپ نے درحقیقت بڑی زحمت گوارا کی خدا کرے لوگ اسکی قدر کریں اور آپ کے ناشر صاحب بھی آپ کی جدوجہد کے نتیجے سے مطمئن ہوں جناب زینب والے مرثیے کا منتظر ہوں۔ کل سے محرم شروع ہے۔

امید کہ آپ مع الخیر ہونگے۔

خیر اندیش۔

آل رضا"

چوبیسواں مکتوب

(۲۲۔ مئی ۱۹۶۷ء)

میں نے ڈاکٹر عابدی صاحب کے مضمون کے چند اقتباسات استاد محترم کو ارسال کیے تھے ان اقتباسات کو پڑھ کر وہ بے حد خوش ہوئے اور جب کتاب چھپ کر ان کے پاس پہنچی تو انھوں نے ہر مضمون کو بار بار پڑھا۔ جب میں کراچی میں ان سے ملا اور میں نے سوال کیا کہ آپ کو کس مقالہ نگار کا مقالہ زیادہ پسند آیا تو انہوں نے جواباً کہا کہ ڈاکٹر عابدی نے مجھے صحیح طور پر سمجھا ہے۔

یہ میرے لئے بڑے فخر کی بات ہے کہ وہ اپنی اور جوش صاحب کی مجلس میں میری موجودگی کی خواہش کر رہے ہیں کراچی میں ان کے کئی شاگرد تھے مگر انھوں نے ان سب کی موجودگی کو لائق اعتنا نہ سمجھا اب میرے قارئین کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ان کے بحر رہ شاگردوں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ خدا تمام مضمون نگاروں کو راہ راست کی ہدایت دے اور ان کے دلوں کو گرد کدورت سے پاک کر دے۔

"فردوس کالونی۔ کراچی۔

۲۲۔ مئی ۱۹۶۷ء

عزیز گرامی قدر تسلیم و دعا۔ محبت نامے کا شکریہ

ڈاکٹر عابدی صاحب کی تحریر کا مرسلہ اقتباس میرے لئے بہت طمانیت بخش ہے اور حضرات کے رشحات قلم بھی جو مجھ تک آپ کے ذریعے سے پہنچے ہیں بڑے محبت افزا اور مستحق تشکر ہیں آپ نے تو اس بارے میں نہ معلوم کیا کیا جمع کر لیا ہے اگر یہ کچھ نہ ہوتا تو بھی آپ جس انہماک اور خلوص کے ساتھ مرثیے کی طباعت میں توجہ کر رہے ہیں میرے لئے باعث منت ہوتا جزاکم اللہ۔

نہایت افسوس اور تعجب ہے کہ میرا وہ عریضہ آپ کو دستیاب نہ ہوا جس میں میں نے آپ کے تمام سوالات کے جوابات عرض کیے تھے۔ جس دن مجھے آپ کا خط ملا اسی شام کو میں نے تمام دریافت طلب امور کی مختصر مگر مکمل تفصیل ایک پوسٹ کارڈ میں لکھ کر صبح کے وقت خود اپنے ہاتھ سے ڈاکخانے کے بمبے میں ڈالا۔ اس اہتمام کے باوجود اس تحریر کا آپ تک نہ پہنچنا نارسائی قسمت کے علاوہ اور کیا ہے۔

یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ آپ کچھ نجی معاملات کی الجھن میں مبتلا ہیں دست بدعا ہوں۔

۱۱۔ جون کو یہاں دو نئے مرثیے پیش ہو رہے ہیں صبح کو ۱۱ بجے جوش صاحب حسینیہ ایرانیان میں مرثیہ پڑھ رہے ہیں اور سہ پہر کو ۵ بجے میں انشاءاللہ ڈاکٹر یاور عباس کے دولت کدے پر۔ دونوں جگہ کے سلسلے کی یہ آخری مجلسیں ہیں۔ کیسا جی چاہتا ہے کہ دونوں جگہ آپ بھی ہوتے اگر اسکے لئے یا ایسے ہی کسی کام سے آجانا ممکن ہوتا تو کیا کہنا مرثیہ آپ جیسا مناسب سمجھیں شائع کریں مجھے اس کے متعلق کوئی فکر نہیں ہے خدا کرے آپ مع متعلقین بخیر و عافیت ہوں خدا جانے یہ پوسٹ کارڈ بھی پہنچے گا یا نہیں۔

خدا حافظ۔

آل رضا ''

پچیسواں مکتوب

(۱۲۔ جون ۱۹۶۷ء)

استاد محترم کے مرثیے ''عظمت انساں'' پر مشتمل میری کتاب ''جدید فن مرثیہ نگاری'' ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی میں نے فوراً اس کتاب کی پانچ جلدیں ان کے پاس بھیجیں۔ انھوں نے جستہ جستہ کتاب کے ابواب پڑھے اور مجھے شاباشی کے خطوط ارسال کیے۔ کتاب میں جن معزز مقالہ نگاروں نے جو کچھ تحریر کیا تھا میں نے سب کے سب شائع کر دیے کیونکہ ان میں کتر بیونت کرنے کا مجھے کوئی حق نہ تھا کسی مقالہ نگار نے جوش اور جمیل مظہری کی تعریف کے پل باندھے کسی نے نجم آفندی نسیم امروہوی اور ڈاکٹر صفدر حسین کی مرثیہ نگاری کو سراہا۔ تفصیلی مطالعے کے بعد استاد محترم کو مولانا مرتضیٰ حسین اور ڈاکٹر احراز کے چند جملے پسند نہ آئے جن کا انہوں نے اپنے اس خط میں ذکر کیا ہے۔ میں بطور مدیر ان جملوں کو حذف کرنے کا اختیار رکھتا تھا لیکن یہ سمجھ کر کہ کہیں یہ کتاب بھی کتاب المناقب نہ ہو جائے حذف کرنے پر تیار نہ ہوا۔ استاد محترم جدید مرثیہ نگاری کا ایک تصور ذہنی رکھتے تھے اس لئے انھیں اس کتاب کے چند جملے نامناسب معلوم ہوئے ان کا یہ خیال تھا کہ جو حضرات خواہ وہ نقاد ہوں یا مرثیہ نگار ان کے رنگ شاعری کے مخالف

تھے ان کا تذکرہ اس کتاب میں نہ ہونا چاہئے تھا لیکن میں مقالہ نگاروں کے قلم کا پاسبان نہ تھا نہ ان کے خیالات پر کسی قسم کی قدغن لگانے کا مجاز تھا۔ حالی نے حیات جاوید میں سرسید کے چند خیالات سے اختلاف بھی کیا ہے۔ استادِ محترم کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے جدید مرثیوں سے مبالغہ آرائی اور غلط روایات نگاری نکال کر انھیں ایک سیدھی راہ پر ڈال دیا ہے جس میں استدلال بھی ہے اور تعقل پسندی بھی نہ الفاظ کی ثقالت ہے نہ صنائع بدائع کا بے دریغ استعمال۔ میں یہ تمام خوبیاں کسی اور مرثیہ نگار میں یک جا نہیں پاتا اس لئے استادِ محترم کو سب سے بڑا جدید مرثیہ نگار تسلیم کرتا ہوں۔ خط میں فلاں فلاں کے الفاظ میری سمجھ میں نہ آئے۔

" کراچی۔

۱۴۔ جون ۱۹۶۷ء۔

عزیز محترم ...... تسلیم و دعا۔

آپ نے جو کام بغیر میری تحریک کے از خود کیا اور میرے متعلق جو سامان اہل قلم و اہل نظر کے لئے فراہم کیا وہ اس خلوص کی سند ہے جو آپ کو مجھ سے ہے اور اسکی داد اس ایک جملے میں موجود ہے جو عابدی صاحب کی زبانی ادا ہوا اور آپ نے اس تحریر میں مجھ تک پہنچایا خدا آپ کو اجر خیر دے۔ تمام مقالہ نگاروں نے مجھے اچھے الفاظ ہی سے یاد فرمایا ہے۔ اور اگر کوئی بات کہیں اس سے ہٹ کر ہے تو وہ نقد و تبصرہ کی معمولی بات ہے چاہے مجھے اس سے اتفاق ہو یا نہ ہو۔ میں نے جن باتوں سے کبیدگی خاطر کا اظہار کیا تھا وہ دوسروں کی تعریف کے متعلق اپنی کسی تنگ نظری کی بنا پر نہ تھا۔ جس کا جی چاہے اپنے مرغوب طبع مرثیہ گو کی مدح کرے لیکن چونکہ یہ مضامین جدید مرثیہ نگاروں کے متعلق تھے لہٰذا مجھے اصولاً اس امر سے تکلیف ہوئی کہ جو مرثیہ گو صاحبان (فلاں فلاں) ہمارے رنگ کے مخالف ہیں اور یہاں اسکے خلاف مل کر محاذ قائم کر چکے ہیں ان کے متعلق اس رنگ کی تعریف کے سلسلے میں کیوں ذکر کیا گیا۔ اور ستم ظریفی یہ ہوئی کہ یہ دونوں حضرات سرقہ بازی کی ترکیب میں مشاق ہیں کیا ہمارے مرثیے بھی اسی قسم کے ہیں یہ مضامین پڑھ کر لوگوں کو کس قدر مغالطہ ہوا ہوگا۔ خصوصاً اگر آپ کی یہ کوشش کامیاب ہوگئی

کہ "عظمت انساں" کسی درس میں شامل ہو جائے تو غلط اجزا کی تردید کون کرتا پھرے گا مجھے یقین ہے کہ مرتضیٰ حسین صاحب اور احراز صاحب کو اگر اسکا وثوق ہو جائے کہ حقیقت کیا ہے تو وہ خود اس تحریر پر افسوس کریں گے ادب میں صریحی مغالطہ بہت برے اثرات کا حامل ہوتا ہے ایک صاحب تو اپنا پہلا مرثیہ سب سے پہلے میرے پاس اصلاح کے لئے بھیجیں اور پھر میری اصلاح میں دوسروں کے یہاں سرقہ سے اضافہ کر کے پیش کریں اور احراز صاحب یہ فیصلہ فرمائیں کہ فلاں صاحب کے ساتھ میرا مرثیہ نیک فال ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ چیز تو میرے لئے بہت بد فال ہے۔ میں آپ کے مشورہ کے مطابق تمام مقالہ نگاروں کا ذاتی شکریہ ادا کر دونگا۔ اگر صحت واقعات قابل تعریف چیز ہے تو تخیلی ڈرامہ کی کمی کا تاسف بے محل ہے۔ صحیح روایتوں کا محکمی سے پابند ڈرامائیت کا کرشمہ کس طرح پیش کرے۔

خدا حافظ احقر۔

آل رضا"

چھبیسواں مکتوب

(۳۰۔ جولائی ۱۹۶۷ء)

میں نے اپنے خط میں تحریر کیا تھا کہ ان مقالہ نگاروں کو شکریے کا خط ارسال کر دیں جنہوں نے آپ کے مرثیے پر تبصرہ کیا ہے یہ خط اسی سلسلے میں تحریر کیا گیا ہے۔ تصویر کے متعلق استاد محترم نے خود لکھا تھا کہ میں تصویر چھپوانے کا شوقین نہیں ہوں اسی وجہ سے کتاب میں تصویر شامل نہیں ہے۔

قارئین کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس کتاب کی قیمت ۵۰/۳ روپے اس لئے رکھی گئی تھی تاکہ مومنین اور صنف مرثیہ کے شائقین زیر بار نہ ہوں مگر شاعر ہوں یا ادیب مصنف ہوں یا نقاد ۵۰/۳ روپے کی کتاب بھی خریدنے کو تیار نہیں سو دو سو کتابوں کے علاوہ دس سال کے عرصے میں یہ کتاب فروخت نہ ہو سکی خریدار اور ناشر دونوں خطاوار ہیں خریدار کے پاس ادبی اور مذہبی کتاب خریدنے کے لئے رقم نہیں ناشر کی خطا یہ ہے کہ اس نے کتاب کی کتابت اس کے سائز اور اسکے

گٹ اپ پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ کتاب پر چار ہزار کی رقم خرچ ہوئی تھی مگر دس برسوں میں ناشر کو دو ہزار روپے سے زیادہ نہ مل سکے اس لئے اس نے شاعری کی کتاب چھاپنے سے توبہ کر لی۔

کوئی صنف ادب ہو اسکے چند پرستار ہوتے ہیں۔ وہ ادبی کتابیں خود شائع کرتے ہیں اور لوگوں کو ادبی کتابیں خریدنے کی ترغیب دیتے ہیں غزل نعت آزاد نظم اور نثری نظم کے رسیا کسی نہ کسی طرح اپنا حلقہ وسیع کر لیتے ہیں۔ مرثیہ وہ صنف ادب ہے جس کے بیرونی اور اندرونی دونوں طرح کے دشمن ہیں۔ بیرونی دشمن تو وہ ہیں جو مرثیے کو تعصب کی نگاہ سے جانچتے ہیں اور اندرونی دشمن وہ ہیں جو مرثیے سے تو عقیدت رکھتے ہیں مگر مرثیہ نگار کو روئے زمین پر دیکھنا پسند نہیں کرتے گویا خلاق کے وجود سے انکار اور تخلیق کا اقرار ہے ایسے حالات میں فن مرثیہ گوئی کیوں اور کیسے پنپ سکتا ہے۔

" کراچی۔

۲۰۔ جولائی ۱۹۶۷ء

عزیز گرامی قدر تسلیم و دعا۔ کل میں نے کئی خطوط مضمون نگار صاحبان کے نام آپ کی وساطت سے اس لئے روانہ کئے ہیں کہ آپ کے لکھے ہوئے پتوں میں کالج کا حوالہ تھا۔ جو آج کل بند ہیں آج دو پرچے ملفوف کر رہا ہوں ایک جمال انصاری صاحب کے نام اور دوسرا مولانا مرتضیٰ حسین صاحب کے نام۔ براہ کرام جب بھی سہولت ہو پہنچا دیجئے گا۔ ڈاکٹر احراز صاحب کو ذرا طویل خط لکھنا چاہتا ہوں۔ مرتضیٰ حسین صاحب کو بھی نسیم صاحب کے متعلق کچھ لکھنے کا خیال تھا مگر بیکار سمجھ کر احتراز کیا۔ بہتر ہو کہ احراز صاحب میری تحریر صفدر صاحب کو دکھلا دیں۔ عابد علی عابد صاحب کو ان کے گھر کے پتے سے لفافہ روانہ کیا ہے جس میں صفدر صاحب کا کوئی ذکر نہیں کیا ان کے مشورے کا شکریہ ادا کر کے یہ اطلاع دے دی ہے کہ میں بفضلہٖ اس پر عامل ہوں۔

صاحب پریس ابرار حسین صاحب کو بھی شکریے کا خط بھیج دیا ہے۔ کہاں تک شکریے ادا کروں آپ نے تو احسان کرنے والوں کی بھیڑ لگا دی ہے در حقیقت آپ نے بڑا کام کیا ہے۔ نسیم۔

راحت صاحب قلب کے دورے میں گرفتار ہو کر گھر میں پڑے ہوئے ہیں خدا رحم کرے۔ مدیر ارشاد سے کہہ دونگا جب آپ کی فرستادہ کتابیں آئینگی تو جوش صاحب مجتبیٰ صاحب اور راحت حسین صاحب تک حسن پہنچا دے گا۔ میری کوئی تصویر شاید قمر سلمہٗ کے پاس ہو حسن سلمہٗ اور سجاد سلمہٗ کے پاس بھی ہو سکتی ہے یہ تینوں بچے لاہور ہی میں ہیں قمر سے کہیے شاید وہیں لاہور میں مل جائے ورنہ پھر یہاں سے کسی جانے والے کے ہاتھ بھیجنے کی کوشش کی جائیگی غزل معلی میں جو تصویر چھپی ہے وہی مناسب ہوگی۔ سجاد سلمہٗ کے نام ایک تحریر ملفوف کر رہا ہوں۔ قمر' حسن' سجاد سلمہٗ کے پاس یہ کتاب ''عظمت انساں'' ز جانا چاہیے۔ مسعود سلمہٗ پرسوں یہاں سے گئے ہیں کتاب کے منتظر ہو نگے۔ یہاں بہت سے لوگ اس مطبوعے کے خریدار ہیں بہت سی جلدیں جلد نکل جائینگی۔ کسی کتب فروش سے معاملہ طے کر لیجیے۔ ایک صاحب رضویہ کالونی کے امام باڑے اور دوسرے صاحب مارٹن روڈ کے امام باڑے میں کتب فروشی کرتے ہیں۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ یہاں آج کل وہ گھمس ہے کہ معاذ اللہ۔ اس قسم کی گرمی سے کم ۳۵ برس سے یہاں اس زمانے میں نہیں پڑی۔ ہوش وحواس ٹھکانے نہیں ہیں محسوس ہوتا ہے کہ سب ڈاکٹر صفدر ہوئے جا رہے ہیں۔

خدا حافظ و دعا گو۔

آل رضا

ستائیسواں مکتوب

(۷۔ اگست ۱۹۶۷ء)

میں نے اپنے خط میں تحریر کیا تھا کہ اس وقت دو سوال بہت اہم ہیں اور ان کے جوابات بھی آپ ہی دے سکتے ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ کیا آپ سے قبل جدید رنگ میں کسی اور نے مرثیہ نہیں کہا اور بقول آپ کے آپ ہی اس کے موجد ہیں تو آپ کو اس ایجاد کا خیال کیسے آیا یعنی آپ کے اس جدید رنگ کا

ماخذ کیا ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ نے اس جدید رنگ مرثیہ نگاری کو قائم رکھنے کے لئے کیا کیا؟

استاد محترم نے ان دونوں سوالوں کے جوابات با تفصیل دیئے ہیں اور کوئی لگی لپٹی سے کام نہیں لیا۔ ان کے اس خط میں خوابوں کا بھی ذکر آ گیا ہے مگر انھوں نے تفصیل نہیں بتائی بہر حال دو سچے خوابوں کا ذکر اس موقعے پر بے محل نہ ہوگا۔

پہلے خواب کے راوی مسعود رضا مرحوم ہیں ایام محرم میں سید آل رضا مرحوم کا سارا خاندان اپنے قدیم قصبہ نیوتنی میں چاندرات کو آ گیا تھا دورے کی پہلی مجلس صبح سات بجے شروع ہونے والی تھی جس میں لکھنؤ کے ایک ذاکر ذکر فضائل و مصائب اہلبیت کرنے والے تھے لیکن کسی وجہ سے وہ یکم محرم ۱۳۵۸ھ کو علی الصبح نہ پہنچ سکے تیس چالیس مومنین جمع تھے ادھر مجلس شروع کرنے کا تقاضا بڑھا اور ادھر بانی مجلس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا ایک سفید ریش والے بزرگ نے جو اپنے دو بچوں کے ہمراہ منبر کے بالکل نزدیک بیٹھے تھے پوچھا تاخیر کا کیا سبب ہے لوگوں نے بتایا کہ لکھنؤ سے ذاکر صاحب ابھی تشریف نہیں لائے انھوں نے کہا تو پھر کیا ہوا آل رضا سے کہیے وہ مرثیہ پڑھ دیں۔ آل رضا صاحب کے پاس اس وقت مرثیہ نہ تھا اس لئے مسعود رضا صاحب کو گھر بھیج کر مرثیہ منگوایا گیا اور انھوں نے مجلس تمام کی سب سے زیادہ گریہ ان بزرگ نے کیا۔ اسی رات کو مسعود رضا صاحب نے خواب میں انھی بزرگ اور بچوں کو دیکھا۔ بزرگوار نے کہا آل رضا نے خوب مرثیہ پڑھا ہماری طرف سے ان کا شکریہ ادا کر دینا خواب ہی میں کسی نے کہا اٹھو رسول خدا اور ان کے نواسے آئے ہیں اس آواز پر مسعود صاحب ہڑبڑا کر اٹھے تو وہ شکلیں سامنے تو نہ تھیں مگر اتنا احساس ضرور ہوا کہ عظیم شخصیات کی زیارت سے مشرف ہو گئے ہیں۔

استاد محترم نے میرے استفسار پر کہا کہ مرثیہ پڑھتے ہوئے میں نے ان نورانی چہروں کو ضرور دیکھا تھا مگر میں نے سمجھا کہ قصبے میں کچھ لوگ نئے آ جاتے ہیں کچھ چلے جاتے ہیں اختتام مجلس پر میں قصبے کے پرانے ساکنوں سے ملنے جلنے لگا اتنی دیر میں وہ تینوں شخصیتیں غائب ہو گئیں لوگوں نے بتایا کہ وہ حضرات شاید آپ کے ساتھ لکھنؤ سے آئے ہیں اس لئے ہم نے ان سے کوئی گفتگو ہی نہیں کی۔ آل رضا صاحب نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا کہ اگر مجھے علم ہوتا

کہ یہ حضورؐ ہیں تو میں اپنے اس مصرعے کو ان کی طرف اشارہ کرکے پڑھتا۔

مظہر ذبح عظیم ان کا نواسا نکلا

دوسرا خواب علی محتشم صاحب کے والد علی احمد جعفری مرحوم نے مجھ سے بیان کیا مرحوم عمر کے آخری دور میں مختلف بیماریوں کی وجہ سے نہ صرف کمزور بلکہ پریشان ہو گئے تھے اسی تکلیف اور کرب کے عالم میں انھیں چند منٹوں کے لئے نیند آ گئی اور خواب میں ان سے ایک بزرگ نے کہا کہ آپ پریشان نہ ہوں نماز صبح کے بعد سید آل رضا کا مشہور سلام "سلام خاک نشینوں پہ سوگواروں کا" پڑھ لیا کریں۔ مرحوم نے مجھ سے کہا کہ جس دن سے میں نے یہ سلام پڑھنا شروع کیا میری پریشانیاں ختم ہو گئیں۔

میں ہر سال کراچی جاتا ہوں اور وہاں کے تمام مرثیہ گویوں سے ملاقات کرتا ہوں مجھے کوئی اہم مرثیہ نگار ایسا نہ ملا جس کے دس پانچ مخالف نہ ہوں اور مخالفت کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ اچھا مرثیہ کیوں کہتا ہے اور اس کی مجلس میں زیادہ مجمع کیوں ہوتا ہے۔ سید آل رضا مرحوم نے کراچی میں مرثیے کی ایک فضا تیار کی مگر بعض حضرات کو ان کے بڑھتے ہوئے کام اور کلام سے بلاسبب کد ہو گئی اور انہوں نے نہ صرف ان کے کلام پر تنقید کی بلکہ ان کی ذات پر بھی رکیک حملے کئے۔ استاد محترم نے ان کے بارے میں کس قدر محتاط الفاظ استعمال کئے ہیں۔ جناب راحت حسین مرحوم نے مجھے جو پلندہ ارسال کیا ہے اس میں کئی ایک شعرا کے سرقات کی مدلل فہرست ہے مگر آل رضا صاحب ان سرقات کی تشہیر کے سخت مخالف تھے ان کا قول تھا کہ تمام شعرا کا ایک ہی مقصد ہے یعنی ذکر امام حسینؑ کرنا بس اسی ذکر کو زندہ اور قائم رکھنا چاہئے۔

ریاض حسینی ۱۰/۹ فردوس کالونی کراچی۔

۷۔ اگست ۱۹۶۷ء

مکرم محترم تسلیم۔ تلطف نامے کا شکریہ۔ آپ ماشاء اللہ بڑے ادیب اور صاحب فکر و قلم ہیں۔ "عظمت انساں" میں آپ کا تبصرہ اپنی انفرادیت کا حامل ہے اُردو میں مرثیے کی تاریخ اور ارتقائی

فنار پر آپ کے مضامین پُر از معلومات اور سبق آموز ہوا کرتے ہیں۔ اس حقیر کے متعلق آپ نے جو کچھ ارقام فرمایا ہے وہ میرے لئے بڑا طمانیت بخش ہے۔ جب سے مجھے اس خدمت کی توفیق عطا ہوئی ہے اس وقت سے اب تک اہل فکر و نظر مختلف مقامات پر اور مختلف طریقوں سے اس اس طرح سرفراز فرماتے رہے ہیں کہ میں اسے سرکار حسینؑ کا عطیہ سمجھنے پر مجبور ہوں کیونکہ مجھے اپنی خامیوں کا بحمد اللہ احساس ہے۔ پہلی ہی مجلس سے جس میں کہ میں نے ۱۹۳۸ء میں اپنے علم و اطلاع کے مطابق سب سے پہلے منبر سے اور وہ بھی لکھنؤ کے منبر سے ایک نئے قسم کا مرثیہ پیش کیا اگر کسی نے اس سے بھی پہلے اس قسم کا مرثیہ کہہ کر رکھ چھوڑا ہو یا کسی رسالے میں چھپا ہو اسکی اور بات ہے۔ وقت ماحول اور مذاق زمانہ نے اسکی اتنی قدر کی کہ نہ معلوم کتنے مقام پر بنارس سے لے کر دہلی اور سونی پت تک بلکہ تقریباً ان تمام مقامات میں جہاں بھی تحت اللفظ مرثیہ خوانی کی مجالس ہوتی تھیں مجھے بہ اصرار بلوا بلوا کر سنا گیا اور نہ جانے کتنے معروف اور اجنبی شہر میں مسلمین علمائے کرام شعرائے عظام اولیائے ذی احتشام پُر خلوص مومنین اور مختلف مکتبوں کے ذی شعور سامعین شامل تھے میری ہمت افزائی فرماتے رہے اور وہ چیز بھی جسے ہم آپ مآل کار مجلس سمجھتے ہیں اور انشاء اللہ سمجھتے رہینگے اتنی فراوانی کے ساتھ حاصل ہوتی رہی کہ اگر ہمارے عقیدے کے مطابق مجھ ایسے شدید گنہگار کے سیاہ نامۂ اعمال میں کہیں کچھ دھل گیا ہو تو تعجب نہیں ہے۔ انھیں مجلسوں کے تاثر میں کئی ایسے خواب دیکھے جانے کا حال سننے میں آیا کہ میں دنگ رہ گیا اور مولانا میرے دل کی بات تو یہ ہے کہ میں کم بخت اگر ایسا ہی ڈھیٹ گنہگار نہ ہوتا تو بعض خوابوں کا ذکر سننے کے بعد بجز مرثیہ گوئی کے اور کوئی کام فریضۂ عبادت کے علاوہ نہ کرتا۔ رہا روزی کا وسیلہ تو اسکے لئے کریمؑ کارساز رزاق عالم کے یہاں بہت سی صورتیں تھیں۔ خیر اپنی مرثیہ گوئی کا یہ ماضی لے کر میں ۴۷ء ہی میں کراچی آ گیا جہاں مقامی طور پر تحت اللفظ خوانی سے شاید ہی کوئی شناسائی ہوئی ہو البتہ رفتہ رفتہ ذی شعور سامعین یہاں آ کر جمع ہونے لگے تھے جن میں سے سیکڑوں حضرات مختلف مقامات پر سن چکے تھے اور پھر تو یہ رنگ مرثیہ گوئی ایسا چلا کہ نجانے کتنے مرثیہ گو نمودار ہو گئے اس مرثیہ گو ساز زمانے میں جس کا سلسلہ بفضلہٖ اب بھی جاری ہے مجھے اکثر محسوس ہوا کہ اب میری جگہ خالی نہ رہے گی۔ کچھ لوگوں نے

ذاتی اغراض کے تحت خلل انداز ہونے کی کوشش کی مگر بجز وقتی مدوجزر والی کیفیت کے کچھ اور نہ ہو سکا۔ الحمد اللہ کہ ۵۶ء میں جناب جوش اور ۶۰ء میں جناب نسیم امروہوی بھی آ کر کراچی میں مقیم ہو گئے۔ میں نے جو اپنی جگہ کا ذکر کیا اس میں خدانخواستہ کسی تعلّی کو دخل نہیں دیا ہے میں کیا میرا کلام ہی کیا ایک اوسط درجے کا شاعر ضرور ہوں مگر بہت کم علم۔ جس رنگ میں مرثیہ کہتا ہوں اس رنگ کا موجد نہیں ہوں البتہ مرثیے کی صورت میں اس رنگ کا سب سے پہلا ناشر ضرور ہوں۔ میرے تاثرات کے لحاظ سے وہ رنگ سلام اور نوحوں کی شکل میں جناب نجم آفندی کے کلام نے مراسم عزاداری میں جاری و ساری کر دیا تھا اس رنگ میں جناب نجم کی مرثیہ گوئی تو میری ابتدا سے کئی سال بعد کی بات ہے۔ جناب جوش کے کلام کا کیا کہنا اپنے رنگ میں عجیب و غریب قادر الکلام شاعر اور الفاظ و استعارات کے سب سے بڑے خزانے کے مالک مگر مشکل یہ ہے کہ وہ خود اجنک برابر یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ مرثیہ نہیں کہتے میں ان سے کہیں بے تکلف ہوں بار بار کھلم کھلا کہتا ہوں کہ ہماری ہی خاطر سے ذرا مرثیت کی طرف متوجہ ہو جائیے جس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ میری طبیعت سے یہ چیز بعید ہے اور میں اسکی تردید کرتا ہوں۔ نسیم صاحب قدیم رنگ میں بڑے مشہور اور مشاق مرثیہ گو ہیں مگر...... (میں کچھ عرض نہ کرونگا) اس سال انھوں نے نئے رنگ میں مرثیہ پڑھا جو خوب تھا اس سے پہلے بھی کبھی یعنی بہت ابتدا میں اسی رنگ میں ایک اور مرثیہ کہا تھا مگر اس راستے کو غلط سمجھ کر ترک کر دیا تھا جس کا اعلان انھوں نے امسال منبر سے کیا اس درمیان میں وہ ہمارے جدید رنگ کے مرثیوں کو صرف مسدس سمجھتے تھے۔ میں نے اپنے علم و یقین کے لحاظ سے مذکورہ بالا صحیح واقعات آپ کو اس لئے تحریر کر دئے کہ آپ اس موضوع پر لکھتے رہتے ہیں لہٰذا آپ کے مضامین میں یہ اذکار کسی غلط فہمی پر مبنی نہ ہوں۔ (سب عجلت میں لکھ رہا ہوں غلطی معاف فرما دیجئے گا)۔

مرثیہ گوئی کے قدیم و جدید رنگ کے متعلق اپنے کچھ حالات بھی واضح کرنا چاہتا ہوں مگر صرف اشارے میں تفصیلی گفتگو بشرط حیات انشاء اللہ بوقت ملاقات ہوگی۔ ہمارا قدیم رنگ کا مرثیہ وہ عروج کمال حاصل کر چکا ہے کہ اب اس رنگ میں ظاہرا کوئی گنجائش نہیں معلوم ہوتی تخیل شاعری میں نری نقالی بلکہ مصرعوں اور بیتوں کی چوری نہ معلوم کتنے زمانے سے رائج ہے کوئی اسکی تحقیق کرے تو معلوم

اور یوں تو "سب کچھ چلتا ہے" والے زمانے میں بھی کچھ چلا کرے گا اس بازی گری کے مشاق یہ سمجھتے تھے اور اب بھی سمجھتے ہیں کہ ہمارے ماخذ یا مال غنیمت کی حقیقت کی اطلاع ہی کس کو ہے اگر دو چار ہو بھی تو اس سے ہماری شہرت کا کیا بگڑے گا۔ اور در حقیقت ہوتا بھی یہی ہے قدیم رنگ مرثیہ گوئی حول اور مذاق زمانہ کے لحاظ سے بڑا سمجھا بوجھا اور نہ معلوم کتنے اقدار کا حامل تھا جن میں سے بعض قدر دوامی بھی ہیں ان مرثیوں کو اس زمانے میں بھی برابر پیش کرتے رہنے میں ذرا بھی تامل نہ کیا جائے جیسا کہ کراچی کی بعض مجالس میں ہوتا ہے لیکن جب اصل شے موجود ہو اور باآسانی مہیا بھی تو بناوٹی قسم کی اشیاء خواہ مخواہ کیوں موجب فخر بنائی جائیں محض ثواب کا مسئلہ کچھ اور ہے اور مقام ادب کچھ اور۔ ایسا مرثیہ بھی سنا ہے جو مختلف شعراء کے منتخب اجزائے کلام کا مجموعہ بنا کر مرثیہ گو نے نہیں مرثیہ خواں نے پیش کیا وہ بھی کار ثواب ہے۔

ہمارے رنگ قدیم کے مرثیوں پر کچھ اعتراضات بھی ہو چکے ہیں کچھ تو کسی حد تک درست تھے اور کچھ محض تعصب اور جہالت سے۔ کہیں کہیں پر ہم کو جواب میں کہنا پڑتا ہے کہ مرثیہ گو شاعر ہے مورخ نہیں۔ اکثر مقامات پر روایت کی بے حد کمزوری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اب اگر کوئی مرثیہ اس رنگ کا پیش کیا جائے کہ آپ کے اعتراضات صحیح ہوں یا غلط لیجئے یہ مرثیہ سنئے مگر سنئے تو۔ ایسی حالت میں اس رنگ جدید کو رنگ قدیم کا مدمقابل کیوں سمجھا جائے یہ سمجھنے میں آخر کیا دقت ہے کہ ایک رنگ وہ ہے اور ایک الگ رنگ یہ ہے دونوں کوششیں ایک ہی مقصد کے تحت میں کی گئی ہیں۔ اپنے مذاق کے مطابق جو چاہے پسند کر لیجئے۔ حضور والا ہمارے نوجوان بہت بہکے ہوئے ہیں اور بہت زیادہ بہکائے جاتے ہیں۔ حتی الوسع اس کا دفعیہ ضروری ہے ہماری مرثیت کے بہت دشمن ہیں اور ہمیں اب کام ذکر حسینؑ سے ہمارے قائم رکھنا ہے۔

خدا حافظ منت کش احقر۔

آل رضا "

اٹھانیسواں مکتوب

(۷۔ اگست ۱۹۶۷ء)

جناب سجاد صاحب نے ایک ہزار کتاب میں سے دوسو روپے دے کر پچاس نسخے معززین کے لئے خرید لیں باقی کتابیں میں نے خرید کرادیں' شاعروں' صحافیوں' عالموں' نقادوں' مومنوں اور لیڈروں کو دیں۔ جن حضرات کا خط میں ذکر ہے انھیں بھی کتابیں ارسال کردی گئیں۔ چونکہ استادِ محترم نے تصویر کی اشاعت پر پابندی لگادی تھی اس لئے تصویر نہیں شائع کی گئی۔ جناب جسٹس رحمان صاحب ادب نواز ضرور تھے مگر مرثیے سلام اور منقبتوں سے الرجک تھے وہ اکثر جسٹس رستم کیانی مرحوم کے یہاں تشریف لاتے تھے اور میں کیانی مرحوم کی اولاد کو پڑھاتا تھا اس لئے وہاں کی گفتگو سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مرثیے کو ادب کی صنف ہی نہیں سمجھتے تھے۔ بہر حال کتابیں سب کے پاس ارسال کردی گئیں۔

" کراچی۔

۷۔ اگست ۱۹۶۷ء

عزیز گرامی قدر۔ تسلیم و دعا۔ خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔ آپ کے خط کا جواب دے چکا ہوں۔ سجاد سلمہٗ آئے آپ کے متعلق باتیں ہوتی رہیں معلوم ہوا کہ پچاس نسخوں کو مناسب اشخاص کے پاس بھیجا جانے کا انتظام انھوں نے کردیا ہے۔ آپ نے اس کتاب کی ترتیب و اشاعت میں جو کد و کاوش کی ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔

ڈھاکہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس آنریبل جسٹس ایس ایم مرشد بڑے ادب نواز اور خود اچھے خاصے ادیب ہیں اہلبیتؑ سے باوجود حنفی ہونے کے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں ایک نسخہ "عظمت انساں" کا ان کے پاس فوراً بھیج دینا چاہئے میرے متعلق یہ بھی لکھ دیا جائے کہ ہاشم رضا سلمہٗ اور مسعود

رضا سلمہٗ میرے چھوٹے بھائی ہیں جب مجھے اس کی اطلاع ملے گی کہ وہ نسخہ ان کے پاس روانہ کردیا گیا ہے تو میں یہاں سے ہاشم سلمہٗ کی تحریر بھجوادونگا۔ مجھے امید ہے کہ وہ اسکی قدر کرینگے۔ ممکن ہے کہ آپ کو مسعود سلمہٗ کا تعارفی خط بھی مل جائے جو اس نسخے کے ساتھ بھیج دیا جائے۔

لاہور میں سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جج اور قائم چیف جسٹس جناب شہاب الدین صاحب قیام پذیر ہیں مسعود سلمہٗ کو ان کی کوٹھی معلوم ہے موصوف مجھ سے بھی واقف ہیں ایک نسخہ انھیں بھی فوراً پہنچ جانا چاہیے وہ مجلسوں میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ ایس اے رحمان صاحب جج سپریم کورٹ بھی بڑے ادب نواز ہیں مسعود سلمہٗ کے ذریعے انھیں بھی کتاب کا ایک نسخہ بھجوادیں۔

ناشر صاحب نے میرے پاس وہ دس کتابیں ابتک نہیں بھیجیں جن میں سے تین نسخے جوش صاحب، مجتبیٰ صاحب اور راحت صاحب کو آپ کی فرمائش کے مطابق مجھے بھیجنا ہے۔

دو تصویریں میں نے سجاد سلمہٗ کو دے دی ہیں مشکل یہ ہے کہ چھاپنے والے تصویریں خراب کردیتے ہیں اپنی تصویریں چھپوانا مجھے پسند نہیں ہے۔ ۱۰۔ اگست کو اگر آپ کراچی آجاتے جیسا کہ آپ نے لکھا تھا تو مجھے خوشی ہوتی بہت سی باتیں کرتا ہیں۔

دعا گو۔

آل رضا"

انتیسواں مکتوب

(۱۵۔ اگست ۱۹۶۷ء)

کتاب کے پبلشر ابرار شیرازی نے محفوظ ایجنسی کراچی کے نام ایک خط تحریر کیا تھا کہ ۲۰ کتابیں سید آل رضا کو دے دی جائیں لیکن افسوس ہے کہ اس نے صرف دس کتابیں دیں۔ میں نے لاہور سے انھیں دس کتابیں رجسٹری کردیں۔ سجاد صاحب نے نہ میرا نہ مولانا مرتضیٰ کا خط

میرے حوالے کیا۔ ستمبر میں استاد محترم لاہور آئے تو اکثر مقالہ نگاروں سے ملنے ان کے گھر گئے۔ ایک دن دو تین گھنٹے تک احسان دانش صاحب سے حال اور ماضی پر گفتگو ہوتی رہی پھر وہ ڈاکٹر ناظر حسن ڈاکٹر اعجاز جمال انصاری ڈاکٹر سہیل اور جناب کسری منہاس کے گھر گئے اور ان کا شکریہ ادا کیا ایک دن شام کو مسعود رضا صاحب کی گاڑی میں میرے گھر آئے اور عابد علی عابد صاحب کے یہاں چلنے کی خواہش کی میں ان دونوں حضرات کو لے کر عابد صاحب کے یہاں پہنچ گیا عابد صاحب مارے خوشی کے پھول گئے اور کہنے لگے سید صاحب میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت میرے یہاں میر انیس آ گئے ہیں استاد محترم نے کہا عابد صاحب کہاں میر صاحب اور کہاں یہ حقیر اور عاجز بندہ۔ آدھ گھنٹے کی گفتگو کے بعد استاد محترم نے رخصت کی اجازت طلب کی عابد صاحب نے چائے کی فرمائش کی استاد مرحوم نے انکار کیا لیکن عابد صاحب نہ مانے پھر وہ اندر چائے لینے چلے گئے استاد محترم نے مجھ سے کہا کہ میں نے ظہرین کی نمازیں نہیں پڑھی ہیں اور سورج ڈوبنے میں پندرہ منٹ رہ گئے ہیں نزدیک مسجد ہو تو چل کر نماز پڑھ لیتے ہیں میں نے کہا مجھے معلوم نہیں کہ اس علاقے میں مسجد کہاں اور کتنی دور ہے چائے آ گئی اور استاد محترم نے جلدی جلدی چائے پی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ گاڑی چلی ایک فرلانگ پر سورج ڈوبتا ہوا دکھائی دیا استاد محترم نے فٹ پاتھ کے قریب کارروائی زمین پر تیمم کیا اور نماز پڑھنے لگے۔ ادھر انہوں نے آخری سلام پھیرا ادھر آفتاب مغرب میں ان کی نماز دیکھ کر غروب ہو گیا۔ ایسا ہی شاعر با عمل یہ مصرع کہہ سکتا تھا۔

ہزار کرب و بلا ہو مگر نماز نماز

"کراچی۔

۱۵۔ اگست ۱۹۶۷ء

محبی تسلیم و دعا۔ آپ کا ایک پوسٹ کارڈ آیا تھا جس سے پہلے ہی میں نے آپ کے نام دو لفافے سجاد سلمہٗ کو دے دیے تھے ایک خط آپ کے لئے تھا اور دوسرا آپ کے پاس اس لئے بھیجا تھا کہ اسے پڑھ کر مولانا مرتضیٰ صاحب کو دے دیں۔ یہ تحریر ان کے گرامی نامے کے جواب میں تھی۔ معلوم ہوتا

ہے کہ سجاد سلمہٗ نے وہ دونوں لفافے آپ تک نہیں پہنچائے۔

آج چار دن ہوئے آپ کا ایک اور لفافہ موصول ہوا تھا جو میں نے راحت حسین صاحب کو دے دیا تھا کہ اسے دکھلا کر محفوظ بک ایجنسی سے بیس کتابیں لے آئیں۔ پہلے دن تو دکان بند ملی۔ دوسرے دن جو صاحب ملے انھوں نے صرف دس کتابیں دیں۔ ایک راحت صاحب نے لے لی دوسری جوش صاحب کے لئے روانہ کر دی گئی۔ تیسری مجتبیٰ صاحب کے لئے رکھی ہے۔ ان کا مکان مجھے معلوم نہیں ہے کالج کے پتے سے بھجوانے کی کوشش کی مگر کوئی صاحب پہنچانے والے نہیں ملے۔ آج صبح ہی دو جگہ گیا تھا مگر کام نہیں نکلا۔ بہر حال جلد پہنچا دی جائے گی۔ جس شخص نے یہ کتاب پڑھی اس نے آپ کی دوا دوش کی داد دی۔ میں تو خلوص دل سے معترف ہی ہوں۔ سجاد سلمہٗ کی سعادت مندی ہے کہ انھوں نے ۵۰ کتابوں کی ادائگی کا انتظام کر دیا۔ رضویہ کالونی کے کتب فروش صاحب سے گفتگو ہوئی تھی کچھ کتابیں فروخت ہو گئی ہیں ابھی تو لوگوں کو اس کی اطلاع نہیں ہے کہ یہ کتاب کہاں کہاں سے مل سکتی ہیں۔ ارشاد (اخبار) کے ایڈیٹر صاحب سے میں نے پرسوں خود یاد دہانی کر دی تھی ۱۰۔ اگست کو آپ کا انتظار رہا۔ انشاءاللہ ستمبر میں لاہور میں کچھ روز قیام کرنے کا قصد ہے لیفٹیننٹ کرنل حسن رضا سلمہٗ بہت مصر ہیں خود میرا بھی جی چاہتا ہے کہ وہاں کے قدر دانوں کے ساتھ کچھ وقت صرف کروں۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

خدا حافظ دُعا گو۔

آل رضا"

تیسواں مکتوب

(۸۔ جنوری ۱۹۶۸ء)

قرآن اور حسینؑ کے عنوان سے میری ایک نظم جنوری ۶۸ء کے پیام عمل کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ جس کے درج ذیل شعر پر استاد محترم نے اعتراض کیا ہے۔

اب اس کا قول قولِ نبیؐ قولِ مرتضیٰؑ
اب اسکا ذکر ذکرِ حسنؑ ذکرِ فاطمہؑ

میں نے اضافت ہی کی وجہ سے قول مرتضیٰ اور ذکر فاطمہ کو ہم قافیہ سمجھا تھا مگر انھوں نے اسے غلط بتایا۔ اور بغیر اضافت کے مرتضیٰ اور فاطمہ کو درست قرار دیا۔

منور سلطانہ صاحبہ لاہور میں مستقل سکونت رکھتی تھیں ان کے والد بسمل لکھنوی جناب ذاخر لکھنوی کے شاگرد تھے خود منور صاحبہ نور لدھیانوی کی شاگرد تھیں ابوالحسن نقی صاحب (ریڈیو پاکستان لاہور) کا خیال تھا کہ وہ شاعرہ نہ تھیں بلکہ غزلیں اچھے ترنم سے پڑھتی تھیں آج تک ان کا دیوان شائع نہ ہوا۔ میں نے ان کے سلاموں پر اسوقت تبصرہ کیا تھا جب میں ان کی اصل حقیقت سے ناآشنا تھا۔ ایک ملاقات میں میں نے انھیں آل رضا صاحب کا پیغام پہنچا دیا تھا۔

" گارڈن ایسٹ کراچی۔

۸۔ جنوری ۱۹۶۸ء

محبی تسلیم و دُعا۔ سلامت خوش اور آباد رہیے۔ عید اور نئے سال کی تہنیت قبول فرمایئے۔ دست بہ دُعائے خیر ہوں۔ آپ کے گرامی نامے کا جواب بھیج چکا ہوں کئی دن کی بات ہے۔ پیام عمل (رسالہ) موصول ہوا۔ آپ کی نظم بھی دیکھی خوب ہے۔ خدا کرے آپ کو یہ سعادتیں نصیب ہوتی رہیں۔ ترویج و تبلیغ مذہب حقہ کی توفیق بڑی نعمت ہے۔

اپنی احتیاط کے لحاظ سے ایک امر کی جانب اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ذکر فاطمہ میں فارسی ترکیب استعمال ہونے کی وجہ سے الف نہیں پڑھی جائے گی لہذا مرتضیٰ کا ہم قافیہ نہ ہو سکے گی۔ یہ استعمال صرف اُردو میں جائز ہے یہ امر تو آپ خود بھی جانتے ہیں اس مرتبہ نظم کرتے وقت شاید خیال نہیں رہا یا آپ نے اس طرح اس کا لحاظ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ مولانا مرتضیٰ حسین سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہہ دیجئے گا۔ حسن رضا سلمہٗ کے پاس غزل معلی کی دو جلدیں بھیج رہا ہوں جو ۱۲۔ جنوری تک پہنچ جائینگی۔ آپ وہ کتابیں ان سے لے کر ایک مولانا مرتضیٰ صاحب اور دوسری عابد علی عابد صاحب کو پہنچا

دیجئے گا۔ ممنون ہونگا۔

منور سلطانہ صاحبہ قبل رمضان المبارک کسی مشاعرے میں کراچی آئی تھیں میرے مکان واقع فردوس کالونی پر مجھ سے ملنے آئیں مگر میں موجود نہ تھا۔ مجھے ان کا موجودہ پتہ معلوم نہیں ورنہ معذرت نامہ ارسال کر دیتا اور شکریہ بھی ادا کرتا آپ ٹیلیفون سے اگر ان کے اسکول میں ہو تو میرا پیغام پہنچا دیں۔ یا کہیں ملاقات ہو جائے تو زبانی کہہ کر اس سے بڑھ کر زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہونگے۔

خدا حافظ دُعا گو۔

آل رضا "

اکتیسواں مکتوب

(۳۱۔جنوری ۱۹۶۸ء)

میں نے ایک نظم جس کا عنوان "اک دن" ہے استاد محترم کو برائے اصلاح روانہ کی میرا مطلع درج ذیل ہے۔

یہ ظلم کا سیلاب گزر جائے گا اک دن
جو مارنے والا ہے وہ مر جائے گا اک دن

استاد محترم نے دوسرا مصرع بدل کریوں کر دیا ہے۔

دریا جو چڑھا ہے وہ اتر جائے گا اک دن

سہیل بنارسی کی کتاب "شہود عرفاں" میں نے بھیجی تھی جس کا انھوں نے شکریہ ادا کیا ہے۔ کلام کی چوری ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی اس میں لکھنؤ اور دلّی کی تخصیص نہیں ہے بڑا شاعر خواہ بھارت کا ہو یا پاکستان کا یہ جرم کرنے کی ہمت ہی نہیں کرتا اور اگر کوئی کرتا بھی ہے تو پکڑا بھی جاتا ہے۔

" گارڈن ایسٹ کراچی۔

۳۱۔جنوری ۱۹۶۸ء

عزیز محترم سلامت رہئے۔ آپ کی نظم کسی اصلاح کی محتاج نہ تھی لیکن یہ خیال کر کے کہ آپ اسے میری سہل انگاری سمجھیں کچھ دخل در معقولات والی بات کر دی ہے۔

سہیل صاحب کو "شہود عرفاں" کی اشاعت مبارک ہو میرا سلام کہہ دیجئے گا کتاب انشاء اللہ دیکھ کر مستفیض ہونگا۔

جیسا کہ لکھ چکا ہوں کہ کاظم رضا سلمۂ کی شدید بیماری اور نا قابل اطمینان حالت کی وجہ سے سخت پریشان ہوں خود بھی بیمار رہتا ہوں۔ بہر حال شکر خدا ہے رسمی تشکر نہیں بلکہ حقیقتاً کریم کارساز نے بڑی بڑی نوازشیں فرمائی ہیں۔ مجھ ایسا گنہگار جو سلب نعمت والے اعمال میں مبتلا ہو کسی تغیر حال کا کس منہ سے شاکی ہو سکتا ہے۔ مالک کے رحم و کرم سے نا امیدی کفر ہے۔

امید ہے کہ آپ نے میری کتابیں مرتضٰی حسین اور عابد علی عابد صاحب کو پہنچا دی ہوں گی۔ میں نے حسن سلمۂ کو بھی کہا تھا کہ اگر آپ کے ذریعے سے یہ کام نہ ہو سکے تو وہ خود وہ کتابیں پہنچا دیں معلوم نہیں کیا ہوا فون پر دریافت کر لیجئے۔ لکھنؤ سے اکثر حضرات پاکستان آ کر خود یہاں کی جدید مرثیہ نگاری کا رنگ دیکھ گئے ہیں پھر بھی وہ اگر کسی کے بہکانے میں آ جاتے ہیں تو انھیں اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ بیجا شہرت کے بھوکے تو ایسا تماشا دکھلاتے رہتے ہیں دوسروں کے کلام کی کھلم کھلا چوری بلکہ سینہ زوری سے نہ معلوم کتنے شعرا کیا کچھ بن بیٹھے ہیں یہ بہت پرانا کھیل ہے اور بہت عام خود لکھنؤ میں کیا کچھ نہیں ہوا۔ اور ہو رہا ہے اب وہاں رہ ہی کون گیا ہے۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

دعا گو۔

آل رضا "

rekhta.org

بتیسواں مکتوب

(۶۔فروری ۱۹۶۸ء)

''شہود عرفاں'' جناب سہیل بناری مرحوم کی کتاب ہے جسے میں نے استاد محترم کے پاس نقد و تبصرہ کے لئے ارسال کی تھی اس خط میں اسی کے بارے میں چند کلمات تحریر ہوئے ہیں۔شور علیگ بڑے مستند اور سکہ بند شاعر تھے ان کی نثری خدمات بھی بہت اہم ہیں انھوں نے جدید مرثیے پر کوئی مقالہ تو نہ لکھا صرف ایک خط کے ذریعے اظہار خیال کر کے اپنی معذرت کر لی البتہ سرقہ کرنے والوں کو دیدہ دلیر خود فریب' خلق فریب' ادبی چور اور خود مشتہر کہنے کے بعد صائب تبریزی کا درج ذیل شعر نقل کیا ہے۔

ثنائی خود بخود گفتن نہ بد مرد دانا را
حظوظ نفس کے باید چوزن پستان خود مالد

'' کراچی۔

۶۔فروری ۱۹۶۸ء

عزیز محترم سلامت رہئے

''شہود عرفاں'' کا شکریہ۔ میں نے ابھی صرف مقدمہ پڑھا ہے۔خوب ہے۔ سہیل صاحب نے اپنے رنگ میں اچھے اشعار کہے ہیں جن پر ابھی سرسری نظر ڈالی ہے۔قصیدہ گوئی میں انھیں ید طولیٰ حاصل ہے انشاء اللہ بغور مطالعہ کر کے مستفیض ہونگا۔موصوف سے میرا سلام کہہ دیجئے گا۔

شور صاحب کا خط حسب فرمائش فوراً واپس کر رہا ہوں بہت دلچسپ ہے۔امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔افسوس ہے کہ وہ کتابیں ان حضرات تک نہیں پہنچیں۔میں نے حسن سلمہٗ کو لکھا تھا کہ وہ خود ہی پہنچادیں۔آپ کی نظم واپس کر چکا ہوں شاید اب تک پہنچ گئی ہو۔

خدا حافظ دُعا گو۔

آل رضا "

تینتیسواں مکتوب

(۲۲۔ فروری ۱۹۶۸ء)

نگارہ لکھنؤ کا ایک ہفتہ وار اخبار تھا جس کے مدیر میرے بزرگ دوست فضل لکھنوی تھے میں نے اپنے مضامین میں استاد محترم کے ایک خط کا حوالہ دیا تھا جو انھیں پسند نہ آیا افسوس کہ وہ پرچے انھی کی تحویل میں رہ گئے۔

میں نے ان سے سوال کیا تھا کہ ہدیہ زیر سے ہوتا ہے یا زبر سے کیوں کہ عام لوگ اس لفظ کو زبر ہی سے بولتے ہیں اور تحفے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اگر یہ زبر سے درست ہے تو فدیہ کا ہم قافیہ نہیں ہوسکتا اور اگر زیر سے بولا جاتا ہے تو فدیہ کا ہم قافیہ ہوسکتا ہے انھوں نے تحریر کیا کہ ہدیہ زبر ہی سے درست ہے لکھنؤ میں اس لفظ کو زیر سے نہیں بولتے۔ زیر کے ساتھ جو لفظ بولا جاتا ہے وہ ی پر تشدید کے ساتھ ہے یعنی ہدیّہ۔

میں نے اپنے خط میں کاظم صاحب سابق آئی جی سندھ کی صحت کے بارے میں پوچھا تھا جس کا جواب پڑھ کر میں نے اندازہ کرلیا کہ اب ان کے بچنے کی امید نہیں اور واقعی تھوڑے ہی دنوں بعد ان کا انتقال ہوگیا۔

" کراچی۔

۲۲۔ فروری ۱۹۶۸ء

عزیزم سلامت رہیے۔ نگارہ کے دونوں پرچوں کو میں نے حفاظت سے رکھ لیا ہے کہیے تو واپس کردوں۔ اس میں اگر میرے خط کا اقتباس نہ ہوتا تو بہتر تھا میں تو جو کچھ آپ کو بھی تحفہ دیتا ہوں وہ

آپ کے لئے ہوتا ہے۔ اگر میری تحریر یا گفتگو اس مسئلے میں شائع کرتا ہو تو مجھے آپ مطلع کر دیا کریں تاکہ جو کچھ لکھوں یا کہوں وہ موقع کے لحاظ سے تشنہ نہ ہو۔ میرے مشاہدے اور حافظے میں تو ایسی ایسی باتیں ہیں کہ اگر بیان کروں تو ایک دفتر ہو جائے۔

آپ نے جو "ہدیہ" کے متعلق لکھا ہے مجھے اس میں شک ہے لکھنؤ میں میں نے اس لفظ کو کسر سے نہیں سنا ایک لفظ اور ہے کسر کے ساتھ وہ ہے "ہدِیّہ" یائے تحتانی کی تشدید کے ساتھ مگر اس کے معنی اور ہیں۔ یعنی کار زجہت سیرت نہ کہ تحفہ یا منا میں جانور کی قربانی۔ اس کے لئے ہدیہ یا "ہدیہ" استعمال ہوتا ہے خیر سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہدیہ اور فدیہ ہم قافیہ نہیں ہیں۔ یہاں روی ہے ہدیہ کی ی اور ما قبل دال اور مذکر۔ روی متحرک ہے۔ جس کے پہلے حرف کی حرکت قابل لحاظ نہیں مثلاً ہدیہ اور خلیہ کیا یہ الفاظ ہم قافیہ نہیں کیے جا سکتے۔ جانے دیجئے میں نے کسی پر تنقید کرنے کی فکر ہی نہیں کی۔ امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے کاظم رضا کی حالت کیا کہوں میری کمر ٹوٹی جا رہی ہے۔

خدا حافظ دُعا گو۔

آل رضا "

چونتیسواں مکتوب

(۳۰۔ مارچ ۱۹۶۸ء)

میں نے سید آل رضا کی مرثیہ نگاری پر چند مضامین کا ایک بنڈل ان کی خدمت میں ارسال کیا تا کہ وہ ان پر ایک نظر ڈال کر واپس کر دیں میں نے ان سے یہ بھی دریافت کیا کہ کیا ہدیہ اور فدیہ کے قوافی درست ہیں۔ جس کا جواب انھوں نے بالتفصیل اس خط میں دیا ہے اس کے علاوہ میں نے سید کاظم صاحب کی علالت کے بارے میں بھی دریافت کیا تھا۔

"کراچی۔

۳۰۔مارچ ۱۹۶۸ء

عزیز گرامی قدر۔ سلامت خوش آباد اور باطمینان رہئے

محبت نامے کا شکریہ۔ آپ کے فرستادہ مضامین احتیاط سے رکھے ہیں۔ راحت ناصری صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی میرے علم میں عرصے سے ان کا شہر میں آنا نہیں ہوا۔ جب ملینگے تو یہ مضامین انھیں دکھادونگا کاظم رضا سلمہٗ کی نہایت سقیم حالت کی وجہ سے عجیب پریشانی میں مبتلا ہوں دل و دماغ ٹھکانے نہیں ہیں اسکے علاوہ اور پریشانیاں بھی ہیں۔ بہر حال شکر خدا ہے اسکی رحمتوں کی کوئی حد نہیں ہے اسی کے رحم و کرم کا بھروسہ ہے۔

سابق عریضے میں فدیہ اور ہدیہ کے متعلق جو میں نے عروضی پہلو بیان کیا تھا وہ ایک دوسرے صاحب کی رائے تھی جو اس معاملے میں کچھ معلومات رکھتے ہیں اپنے متعلق تو ظاہر کر دیا تھا کہ میں خود عروضی نہیں ہوں کچھ ضروری باتیں کان میں پڑی ہیں ان کے مطابق عمل کرتا ہوں خود میری رائے میں ہدیہ اور فدیہ کا قافیہ صحیح نہیں ہے کم سے کم میرا مذاق سلیم اسکو قبول نہیں کرتا اگر کسی خاص عروضی قاعدے سے یہ صحیح سمجھا جائے تو اسکی بصیرت مجھے حاصل نہیں ہے مگر جو یہ کہے کہ قافیہ تو صحیح نہیں ہے مگر ذرا سی حرکت الفاظ کا تغیر قابل اعتراض نہیں وہ نہ معلوم کس دماغ کا ہے اگر غلط ہے تو کم اور زیادہ غلطی کیا شے ہے۔ اور پھر مسدس کی بیت میں خواہ مخواہ ایک غلطی جان بوجھ کر گوارہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے دوسری بیت کہہ لینے میں ایسی کیا دشواری ہے کہ غلطی رکھی جائے ہدیہ اور فدیہ کے الفاظ رکھ کر بھی کوئی اور قافیہ اور ردیف اختیار کرنے میں کیا مجبوری ہے یہاں جو صاحب ان الفاظ کو ہم قافیہ کہتے ہیں ان سے پھر گفتگو کرونگا اور کتاب سے سند حاصل کرنے کی کوشش کرونگا۔ خدا کرے آپ مع الخیر ہوں خدا حافظ۔
اگر آپ ادھر کراچی تشریف لائے تو دوسرے مرثیے کے متعلق گفتگو ہوگی۔

دُعاگو۔

آل رضا"

پینتیسواں مکتوب

(۱۱۔اپریل ۱۹۶۸ء)

سید کاظم رضا مرحوم کی اچانک اور دلدوز وفات پر میں نے ایک پُر درد تعزیت نامہ استاد مرحوم کو ارسال کیا تھا جس میں ان سے کئی ملاقاتوں کا تذکرہ تھا میں نے ایسے افراد کے نام بھی تحریر کئے تھے جو مرحوم کی شفقت اور محبت کی وجہ سے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو گئے پولیس کے ایک اعلیٰ آفیسر میں دین سے اتنا شغف میں نے کہیں نہیں دیکھا معلوم نہیں وہ شاعر تھے کہ نہیں مگر برمحل اشعار کا استعمال اس خوبی سے کرتے تھے کہ گفتگو میں جان پڑ جاتی تھی۔ میر انیس کے مرثیوں کے بند انھیں یاد تھے اور بڑی روانی سے سناتے تھے۔

استاد مرحوم کا یہ خط میرے اسی تعزیت نامے کا بڑا غمگیں جواب ہے۔

" کراچی۔

۱۱۔اپریل ۱۹۶۸ء

مجی سلامت رہے تعزیت نامے کا شکریہ کیا کہوں دل کی کیا کیفیت ہے بہر حال شکر خدا ہے امام کا مرثیہ کہہ کر یہ غم بہلانے کی کوشش کر رہا ہوں مگر طبیعت اتنی اچاٹ ہے کہ جمتی نہیں دیکھئے کیا ہوتا ہے اس بارگاہ سے تھوڑا بہت منسلک کرتا ہی اس وقت بہت کام آیا۔ جی چاہتا ہے کہ اس در سے اتنا وابستہ رہوں کہ کسی اور طرف خیال ہی نہ جائے مگر اتنا خلوص کہاں میسر۔ 5 محرم کو بروز پنجشنبہ (مہینے کا پہلا پنجشنبہ) گھنٹہ بھر قبل شب جمعہ ہم نے یہ جنازہ اس مجلس میں پہنچا دیا جس میں تمیں چالیس ہزار آدمی شرکت کرتے ہیں کاظم رضا کے انتقال کا پہلا اعلان منبر سے ترابی صاحب کی زبانی ہوا۔ اور بعد ختم مجلس نماز جنازہ اور مشایعت تابوت کا وہ عالم تھا کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے اللہ اللہ یہ ذرہ نوازی ہم گنہگار اسکے کہاں مستحق تھے مگر والا در سرکار حسینی میں نے دو شعر کہے صرف اپنی تسلی کے لئے۔

ٹوٹے ہوئے دل دیکھ تجی کی ہے یہ سرکار
رجتے نہیں محروم شہ دیں کے عزادار

مجلس سے چلا شہ کے فدائی کا جنازہ
کس شان سے اٹھا مرے بھائی کا جنازہ

آہ کاظم رضا سے تاریخ نکلتی ہے۔

خدا حافظ سوگوار۔

آل رضا "

چھتیسواں مکتوب

(۱۳۔مئی ۱۹۶۸ء)

مرثیہ شریکتہ الحسین جناب زینبؑ کے حال میں کہا گیا ہے جوں ہی مرثیہ ملا کتابت شروع ہو گئی پھر بھی بہت سے مصرعوں میں یا تو ابہام تھا یا ہماری عقل وہاں تک نہ پہنچ سکی اس لئے مکمل کتابت شدہ مسودہ کراچی رجسٹری کیا گیا کتابت کی اور بھی غلطیاں نکلیں جنہیں درست کرایا گیا۔ میں نے استاد محترم کو تحریر کیا کہ آپ جدید مرثیے کی روشنی میں اپنے خیالات کا اظہار کر دیں لیکن مرحوم نے اپنی پریشانی کی وجہ سے معذرت کر لی پھر مسودہ ڈاکٹر خاکی مرحوم کے سپرد کیا گیا موصوف سید آل رضا کی مرثیہ گوئی سے ارجمک تھے اس لئے وہ بار بار مجھ سے بحث کرتے تھے۔ دل کے مومن تھے اس لئے ذرا تاخیر سے سہی انھوں نے مقدمہ تحریر کیا نتیجہ یہ ہوا کہ چہلم کے موقع پر یہ کتاب شائع نہ ہو گی اسی کے بارے میں مرحوم نے یہ پورا خط تحریر کیا ہے۔

" کراچی۔

۱۳۔مئی ۱۹۶۸ء

عزیز گرامی قدر۔ سلامت رہئے۔ گرامی نامہ مورخہ ۸۔ مئی مجھے آج ۱۳۔ مئی کو پہنچا غالباً ڈاکخانے تک دیر سے پہنچا۔ میں نے آپ کے تعزیت نامے کا جواب فوراً ارسال کر کے شکریہ ادا کیا تھا۔ زخم خوردہ جذبات کے لحاظ سے میں آج کل عجیب عالم میں ہوں اس پر طرہ یہ ہے کہ ایک نیا مرثیہ بارگاہ خراساں میں ۲۶۔ مئی اور دوسرا یاور عباس صاحب کے گھر پر ۲۔ جون کو پیش کرنا ہے وہ نہایت اہم سلسلے مجالس کے ہیں۔ دماغ کی پراگندگی اور یہ جرثقیل خیر اللہ مالک ہے۔

آپ کی یہ فرمائش سرآنکھوں پر کہ میں اپنے کہے ہوئے مرثیے ...... تھا جہاں پھر وہیں قرآن کو لے آئے حسینؑ ...... پر جدید مرثیہ نگاری کی روشنی میں بطور مقدمہ کچھ لکھوں۔ میاں آپ خود سمجھیں کہ مذکورہ مصروفیت اور پریشانی فکر کو دیکھتے ہوئے یہ کام میرے لئے دشوار ہے کہ نہیں آج کل بہت دل شکستہ ہو رہا ہوں اس حادثے کا اتنا اثر خلاف توقع ہے مگر ہے۔ دل کو کیا کروں آپ نے ترتیب مرثیہ کے بارے میں جو تحریر کیا ہے اس میں مجھے کچھ الجھاؤ معلوم ہوتا ہے آپ نے فرمایا ہے کہ ۶۳ بند سے ۷۰ بند تک کہیں غائب ہو گئے ہیں یعنی ۸ بند لیکن پھر آپ کے پاس جو بند ہیں وہ لائق حمد...... والے مصرعے سے شروع ہو کر فاطمی ہوں...... والے بند پر ختم ہوتے ہیں۔ مرثیے میں یہ بند ہیں ۶۳ سے ۷۵ تک اب آپ ہی فرمائیں کہ مذکورہ تحریر کے دونوں اجزا میں تصادم ہے کہ نہیں۔ اب آپ چاہتے ہیں کہ کل ۹ بند آپ کو لکھ کر بھیج دیے جائیں۔ براہ کرم ذرا واضح طور پر تحریر فرمایئے کہ اب جہلم کے کتنے دن رہ گئے جو اس عرصے میں یہ کتاب چھپ کر تیار ہو جائے گی۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

دعا گو۔

آل رضا"

سینتیسواں مکتوب

(۲۰۔ مئی ۱۹۶۸ء)

مرثیہ شریکۃ الحسین کراچی پہنچا تو استاد محترم نے نہ صرف مصرعوں اور بیتوں میں تبدیلی کی

بلکہ آٹھ نئے بند اور کہہ کر ارسال کر دیئے کاتب نے الفاظ تو درست کر دیں مگر اضافی بند لکھنے پر اس لئے راضی نہ ہوا کہ اس سے تمام صفحات کو کاٹنا پڑتا تھا اس کام کے لئے ایک اور کاتب کو کچھ رقم دے کر مقرر کیا جس نے دو دن میں پھر سے مسودے کو درست کیا۔

اصل میں علامہ رشید ترابی نے یہ روایت بیان کی کہ بعد شہادت امام حسین علیہ السلام جناب زینب سلام اللہ علیہا بھائی کی لاش پر گئیں اور لاش امام حسین علیہ السلام اٹھا کر خدا کا ربنا تقبل منی کہہ کر شکر ادا کیا۔ استاد محترم نے اس ضعیف روایت کو مصدقہ سمجھ کر اپنے مرثیہ شریکۃ الحسین میں چند بند کا اور اضافہ کر دیا۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو وہ روایت غلط ہے جس میں خیام اہلبیت جلنے کے وقت جناب زینبؑ نے امام زین العابدین علیہ السلام سے سوال کیا تھا کہ ہم باہر نکل جائیں یا خیموں ہی میں جل کر مر جائیں۔ جب وہ پہلے ہی نکل کر سپاہ یزیدی کے سامنے دن دھاڑے امام حسین علیہ السلام کی لاش تک جا چکی تھیں تو پھر امام سے باہر نکلنے کے لئے اجازت طلب کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔

" کراچی۔

۲۰۔ مئی ۱۹۶۸ء

عزیز محترم۔ نہایت عجلت میں یہ خط لکھ رہا ہوں کیونکہ آپ نے تعجیل کی فرمائش کی ہے میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ آج کل کس قدر دل شکستہ پریشان حال اور اس کے ساتھ نئے مرثیے کی تیاری میں مصروف ہوں دل و دماغ ٹھیک طرح سے کام نہیں کرتے بہر حال شکر خدا ہے۔

میں نے جو غزل معلی کی کتابیں عابدی صاحب اور مرتضیٰ حسین صاحب کو بھجوائی تھیں وہ حسن سلمہٗ کی تحریر کے مطابق ان حضرات تک پہنچنے کے لئے کسی ذریعے سے روانہ کر دی گئیں معلوم نہیں کہ واقعی پہنچیں بھی کہ نہیں۔

دفتر رضا کاری طرف کبھی نکلئے تو صدیق صاحب سے عرض کر دیجئے کہ میرے لڑکے سجاد سلمہٗ

نے دو سال کا چندہ جمع کیا ہے صدیق صاحب اپنے دفتر کے حساب دیکھیں کہ ان کے حساب سے کس سال کی کس تاریخ کو ایک سال کا چندہ جمع ہوا تاکہ میں سجاد سلمہٗ کو مطلع کر کے ان سے دریافت حال کراؤں جو سجاد میاں کے دفتر سے رقومات لے کر دفتر رضا کار گئے تھے صدیق صاحب کو میرا موجودہ پتہ بھی بتلا دیں۔ اب مجھ سے کچھ اور لکھا نہیں جاتا جو کچھ لکھا ہے نہ معلوم کس طرح۔

خدا حافظ دعا گو۔

آل رضا "

اڑتیسواں مکتوب

(۲۳۔ مئی ۱۹۶۸ء)

۱۹۶۷ء میں استاد مرحوم پر میں نے ایک کتاب " جدید فن مرثیہ گوئی" شائع کی جس میں نمونے کے طور پر ان کا ایک نایاب اور شہکار مرثیہ "عظمت انساں" شامل کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ خود مرحوم کے قلم سے جدید مرثیے کے فن پر ایک مضمون شامل ہو۔ افسوس ہے کہ ناسازی طبع کے باعث وہ مضمون نہ لکھ سکے اگر مرحوم یہ حکم دیتے کہ ان کا ۳۹ء والا مضمون شامل کر دیا جائے تو میں حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا۔

موصوف کو غالباً کتاب کی اشاعت کے بعد خیال آیا کہ اس کتاب میں ان کا مطبوعہ مضمون شائع ہونا چاہیے تھا اس خط میں یہ جو انھوں نے تحریر کیا ہے کہ میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ میرے اس مضمون کو شامل کتاب کر دیں After Thought معلوم ہوتا ہے مرحوم کی مزاجی کیفیت سے بھی بعید ہے کہ وہ اپنے مضمون کو کتاب میں شامل ہونے کی درخواست کریں۔ مرحوم کا وہ مضمون حقیقتاً اس دور میں نئی چیز تھا مگر اب تنقید کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے کہ قدیم تنقیدیں بچوں کا کھیل معلوم ہوتی ہیں۔

" کراچی۔

۲۳۔مئی ۱۹۶۸ء

مجی تسلیم و دعا۔آپ کے جواب طلب گرامی ناموں کا جواب ارسال کر چکا ہوں مرثیے کے مطلوبہ بند بھی لکھ چکا ہوں صرف ایک فرمائش کی تعمیل نہیں کی یعنی جدید مرثیہ نگاری پر تبصرہ۔آپ کے مطالبے کے خلوص کی وقعت میرے دل میں بہت ہے لیکن اسے تحصیل حاصل سمجھتا ہوں اس معاملے میں شاید آپ میں اور مجھ میں اختلاف رائے ہے میں نے اس پر پھر غور کیا مگر اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا آپ بھی پھر غور فرمالیں شاید میری بات قابل اعتنا نکلے بھائی مجھے اس موضوع پر جو کچھ لکھنا تھا یعنی اپنے رنگ مرثیہ کے متعلق وہ میں بالتفصیل ۳۹ء میں قلمبند کر چکا ہوں اور اس وقت جب یہ بات بالکل نئی تھی جو میرے نزدیک اس وقت تک یعنی ۳۰ سال گزر جانے کے بعد بھی پرانی نہیں ہوئی بلکہ زمانے کی رفتار کے ساتھ برابر موثق ہوتی جاتی ہے۔اس زمانے میں اس بات کی تردید بھی نہیں ہوئی جبکہ اکثر مجلسی حضرات اس نئے رنگ سے بچکتے تھے اور اب تو اکی مسلسل تائید ہی ہوتی چلی جاتی ہے معلوم نہیں آپ کا خیال اس طرف کیوں نہیں جاتا "عظمتِ انساں" کی طباعت کے وقت میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ آپ میرے اس مضمون کو پھر سے چھپوا کر اس کتاب میں شامل کر دیجئے اور اب پھر وہی چیز عرض کرتا ہوں بھی اس کو غور سے پڑھ تو لیجئے ناممکن ہے کہ آپ کا ساذہین ادیب ان چیزوں کی نمایاں قدر نہ سمجھے جو اس وقت میرے قلم سے نکل چکی ہیں اور اب انھیں ایک قسم کی پیش گوئی کا درجہ حاصل ہو چکا ہے جو پوری ہوئی اور بھر پور۔

میرے دو مطبوعہ مرثیے آپ کے پاس موجود ہیں پہلا ۳۹ء میں شائع ہوا تھا آپ صرف وہ حصہ لے لیں جو صفحہ ۸ تک ہے۔"خلق خدا کا بھی نمائندہ ہے" پر ختم ہوتا ہے۔امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

خدا حافظ منت کش۔

آل رضا "

انتالیسواں مکتوب

(۹۔دسمبر ۱۹۶۸ء)

میں نے لفافے میں ایک سلام ارسال کیا تھا جو درج ذیل طرح میں کہا گیا تھا۔

حسین سارے زمانے کی روشنی لائے

ایک ہفتہ گزرنے کے بعد جب بعد اصلاح سلام واپس نہ آیا تو میں نے خطوط روانہ کئے اور درخواست کی کہ سلام جلد از جلد بھیج دیں مگر وہ میرا لفافہ دفتر میں کہیں رکھ کر بھول گئے۔میرا مطلع درج ذیل تھا۔ جسے آپ نے تبدیل کر دیا اور تبدیلی کی وجوہات بھی تحریر کریں۔

میرا کہا ہوا مطلع..........

سیاہ دل میں وہ احساس آگہی لائے
حسینؑ ایسی محبت کی روشنی لائے

بعد اصلاح..........

حسینؑ ساتھ وہ اقدار آگہی لائے
کہ موت خود ہی تب و تاب زندگی لائے

آگہی اور روشنی میں کیوں کر ایطا داخل ہو گیا میری سمجھ میں نہ آ سکا مگر استاد کا ہر حکم سر آنکھوں پر۔ قمر مرحوم نے نہ مجھ سے رابطہ کیا نہ مجھے علم ہو سکا کہ یہ شبر حسین صاحب کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔

کراچی۔

۹۔دسمبر ۱۹۶۸ء

محبیٌ سلامت رہیے

آپ کے دو پوسٹ کارڈ اور لفافہ ملے جس میں ایک سلام کے کچھ شعر ہیں لفافہ دفتر میں ایک ہفتہ قبل پہنچ گیا تھا۔ مگر خدا جانے میں نے کیوں وہیں ڈال رکھا تھا۔

آج قمر سلمۂ کا فون بھی آیا کہ مرثیہ انہیں مل گیا۔ اور یہ مرثیہ وہ خود ایک صاحب (شبر حسین) کے یہاں پڑھینگے۔ میرا دل خوش ہوا کہ ایک غیرت مند بچے کو کم سے کم اس خیال کی توفیق تو ہوئی۔ اندیشہ ہے کہ پڑھنے میں وہ کچھ غلطیاں نہ کر جائیں لہٰذا اگر موقع ہو تو فوراً ان کے پاس جا کر مناسب ہدایتیں دے دیں۔ شروع کے چار پانچ بند جو امام حسینؑ کے حال میں ہیں پڑھ کر بقیہ چھوڑ دیں۔ اسکے بعد بیسویں بند پر آجائیں یعنی "اس کو مجرا جو ہوئی اس میں برابر کی شریک" اسکے بعد ثانی زہرا کا حال ہے جس کا کچھ حصہ دہرا کر پڑھیں۔

آپ کا سلام (پشت پر) میں نے دیکھ لیا ہے طرح مشکل تھی مگر آپ نے بفضلہٖ نہایت کامیاب کوشش کی ہے اور حسین ہی لائے والا شعر تو لاجواب ہے۔ ماشاءاللہ۔

مطلع یوں تو خاصا تھا مگر مجھے دو قباحتیں محسوس ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ "سیاہ دل" میں پر اثر پذیری کا محدود ہو جانا مناسب نہیں اور یہاں "کی" کی بھی ضرورت ہے دوسرے یہ کی آگہی اور روشنی کے قافیوں میں "ایطا" یعنی شائگاں ہو جاتا ہے۔ جس کا لحاظ عموماً لوگ نہیں کرتے مگر میرا طریقہ دوسرا ہے۔ دوسرے مصرعے میں اگر زندگی آجائے تو ایطا کی بات رفع ہو جاتی ہے۔ امید کہ آپ مع الخیر ہونگے۔

خدا حافظ۔

آل رضا"

چالیسواں مکتوب

(۱۳۔ جنوری ۱۹۶۹ء)

۳۔ دسمبر ۱۹۶۸ء کو میری والدۂ مرحومہ کا انتقال ہوا تو میں نے دُعائے مغفرت کے لئے استادِ محترم کو مطلع کیا۔ پھر جب ان کے بڑے بیٹے قمر رضا کا انتقال ہوا تو میں نے ایک نہایت ہی افسوسناک اور دردناک خط کے ذریعے انھیں تعزیت پیش کی۔ اس خط میں انہی دونوں واقعات کا تذکرہ ہے قمر مرحوم کی اچانک موت نے ان کا دل ہلا دیا۔ اگرچہ انھوں نے واقعہ کربلا سے متاثر

ہو کر صبر تو کیا مگر بیٹے کے اندر ان کا دل ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ بقیہ زندگی میں وہ سب کچھ بھول گئے مگر قمر مرحوم کی وفات کا غم نہ بھول سکے۔

" گارڈن ایسٹ کراچی۔

۱۳۔ جنوری ۱۹۶۹ء

عزیز محترم۔ تسلیم و دعا۔ محبت ناموں کا شکریہ۔ ایک خط ۹۔ جنوری کا لکھا ہوا اور دوسرا ۱۰۔ جنوری کا تعزیت نامہ ۳۔ دسمبر کا کوئی خط مجھے نہیں ملا ورنہ ممکن نہ تھا کہ مجھے آپ کی والدۂ مرحومہ کے سانحۂ ارتحال کی اطلاع ملتی اور میں فرضِ تعزیت ادا نہ کرتا خدا مرحومہ کو غریقِ رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ ماں ماں ہے کسی عمر میں بھی اس کا سایا اٹھ جانا ایک بڑی نعمت سے محروم ہو جانا ہے۔ مگر آپ یہ بھی تو چاہ نہیں سکتے تھے کہ وہ آپ کو چھوڑ کر سفرِ آخرت اختیار نہ کریں۔ آپ اس پُر خلوص محبت کی وجہ سے میرے لئے ضرور مضطرب ہو نگے مگر میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس سخت امتحان کے وقت خدا کے فضل اور سرکار حسینؑ کی مدد نے مجھے ایسا ایسا سنبھالا کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ اس خیال نے کہ مجھے ذاکرِ حسینؑ ہونے کا شرف حاصل ہے اور ایسے وقت اس کی کچھ ذمہ داری بھی ہے میں وہ کمزور دل والا آل رضا نہ تھا جو لوگ سمجھتے تھے یوں تو دل پاش پاش ہو جانا ہی چاہیے تھا میں اور بغیر میرے قمر کے یہ دنیا! مگر واہ رے کریم کارساز کی رحمت اور اپنے کربلا والوں کا دیا ہوا سبق کہ برابر یہ محسوس ہو رہا ہے کہ کوئی بڑی محبت سے مجھے کلیجے سے لگا رہا ہے۔ ایک خاص کیفیت میں یہ شعر تو کہا کہ۔

شام سے یوں تو رہا وقت اندھیرے کا مگر
اب ہوئی رات تو اب چاند مرا ڈوب گیا

لیکن پھر زباں سے یہ بھی نکلا کہ "غمِ حسینؑ ہے سب کچھ غمِ قمر کیا ہے" انا للہ وانا الیہ راجعون۔ رضا بقضاہٖ و تسلیماً لامرہٖ دعا کیجئے کہ الفاظ صرف زبان ہی پر نہ آئیں بلکہ دل کی بھی یہی کیفیت ہو جائے۔ قمر کے لئے دعائے مغفرت فرمایئے اللہ آپ کو خوش رکھے اور جزائے خیر دے۔

گنہگار۔

آل رضا "

اکتالیسواں مکتوب

(۱۷۔فروری ۱۹۶۹ء)

سید آل رضا کے جواں سال بیٹے کے انتقال پر ان کے چند مداحوں نے مجھے خطوط دیئے جنہیں میں نے ان کی خدمت میں کراچی ارسال کر دیے۔ اس صدمے کو کم کرنے کے لیے میں نے انہیں لاہور آنے اور مرثیہ پڑھنے کی دعوت دی مگر چونکہ مارچ کے مہینے سے محرم شروع ہونے والا تھا اس لئے مرحوم نے معذرت کر لی البتہ وعدہ کیا کہ جلد ہی لاہور آئیں گے خط میں کراچی اور لاہور کی مرثیے سے رغبت کا نہایت عمدہ اور مدلل تذکرہ ہے۔

" ۱۰/۵۳۸ گارڈن ایسٹ کراچی۔

۱۷۔فروری ۱۹۶۹ء

عزیز محترم تسلیم و دعا۔ تلطف نامے کا شکریہ لاہور سے آئے ہوئے خطوں سے محبت کی خوشبو نکلتی ہے میں آپ سب حضرات کا کس طرح شکر ادا کروں اس ضعیفی میں میری یہ امتحانی زندگی جس دور سے گزر رہی ہے اسکی بہترین آماجگاہ لاہور ہے۔ اور میرے لئے لاہور کے معنی ہیں صرف وہ حلقۂ احباب جس میں میرے گزشتہ قیام کا دلچسپ زمانہ گزرا اور ایسا محسوس ہوا کہ بہت جلد گزر گیا۔ حالانکہ مہینے بھر کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا ملفوف تعزیتی مجموعہ میں جن کرم فرما حضرات کے نام تحریر ہیں ان سب کو میری دست بستہ تسلیم کہئے اور فرداً فرداً پر خلوص شکریہ ادا کر دیجئے۔ آج کی ڈاک میں دو تحریریں اور موصول ہوئیں ایک ظہور حیدر صاحب کی اور دوسری عباس حیدر عابدی صاحب کی (یہ موصوف کا دوسرا

ہوتا ہے) جب بھی ان حضرات سے ملاقات ہو جائے یا ٹیلیفون یا کسی اور ذریعے سے پیغام پہنچایا جا سکے تو میری جانب سے دلی شکریہ پہنچا دیجئے ظہور صاحب کو میں علیحدہ بھی خط بھیج رہا ہوں میرے لئے کراچی میں ایام عزا کی مصروفیتیں کچھ اس طرح وضع میں شامل ہو گئی ہیں کہ لاہور کی کشش کے باوجود ترک کرتے نہیں بنتا۔ وضعداری کے ساتھ ذمہ داری بھی وابستہ ہے یہاں کی مرثیہ گوئی میں جو غیر معمولی چہل پہل اور رونق ہے اس کے قیام کا شرف مجھے حاصل ہوا ہے اور چاہتا ہوں کہ جب تک دم میں دم ہے اپنے اس فریضے کی ادائی میں کمی نہ کروں خود اپنی خوانندگی کے علاوہ یہاں رنگ جدید میں ہر مرثیہ کہنے والا یہ چاہتا ہے کہ مجلس میں میں بھی موجود ہوں یہ ہمت افزائی جو میری ذات سے منسوب کر دی گئی ہے میری جان کے ساتھ ہے جو خود میرے لئے موجب سعادت ہے۔ یہ شمع اب بہت جلد بجھنے والی ہے شمع سے مطلب میرا کلام یا میری شخصیت نہیں ہے بلکہ وہ گہرا تعلق ہے جو اس فضا سے مجھے ۴۷ء سے پیدا ہو چکا ہے بہر حال مجھے یہ فکر تو ضرور رہے گی کہ عنقریب کچھ دن لاہور جا کر قیام کروں اور مرثیے پڑھوں سرکار حسینی نے مجھے اس عالم میں ایسا ایسا سنبھالا ہے کہ میں اسے اعجاز سمجھتا ہوں مرنے کے بعد کا حال خدا جانے مجھے تو اس ذکر سے تھوڑی بہت وابستگی نے زندگی ہی میں کیا کچھ نہ مرحمت فرمایا ورنہ اس جانکاہ سانحے کے بعد میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا۔ خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔

خدا حافظ۔

آل رضا"

بیالیسواں مکتوب

(۱۶۔ ستمبر ۱۹۶۹ء)

۲۸۔ ستمبر کی تاریخ پر میں اس لئے اصرار کر رہا تھا کہ اس تاریخ کو اتوار تھا اور ماہ رجب کی سولھویں تھی لاہور کی ایک اہم انجمن اولوالالباب نے نہایت تزک و احتشام سے میلاد حضرت علیؑ

کا اہتمام کیا تھا۔ پروفیسر وزیر الحسن عابدی اور شیخ محمد طفیل ایڈیشنل کمشنر لاہور اس کے مہتمم تھے یہ محفل میلاد گلبرگ کے امام بازہ النجف میں منعقد ہوئی آل رضا مرحوم ۲۷۔ ستمبر ہی کو آ گئے تھے۔ میں نے مسعود رضا مرحوم سے کہہ دیا تھا کہ اگر استاد محترم آپ کی کوٹھی واقع گلبرگ میں ٹھہرے تو کوئی شاعر ان سے ملنے نہ آ سکے گا اس لئے بہتر ہے کہ موصوف کن آباد میں پروفیسر عابدی کے مہمان ہوں۔ ایئر پورٹ پر گاڑی سمیت میں بھی اور مسعود رضا مرحوم بھی موجود تھے۔ آل رضا نے اپنے بردار خرد سے معذرت کی اور میرے ساتھ کن آباد آ گئے اتفاق دیکھئے کہ محفل کو شروع ہوئے ایک گھنٹہ ہوا تھا کہ صدر دروازے پر سید ہاشم رضا صاحب نمودار ہوئے میں نے ان کا استقبال کیا اور ہمارے موجودہ شعرا میں ایک اہم شاعر کا اضافہ ہو گیا۔ اب ایسی پاک اور نایاب محفلیں خواب و خیال ہو گئیں۔

"بی/۱۵ ڈیفنس سوسائٹی کراچی۔

۱۶۔ ستمبر ۱۹۶۹ء

عزیز گرامی قدر سلامت رہئے لفافہ مع گرامی نامہ ابھی ابھی موصول ہوا جس خط کا آپ نے ذکر کیا مجھے نہیں ملا۔ مجھے خود تعجب تھا کہ آپ نے مع الخیر رسی کی اطلاع بھی نہیں دی۔ خود ہی لکھ کر پوچھنے کا تصور کر رہا تھا۔ میں نے بشرط حیات و درستی صحت یہ قصد کیا تھا کہ شروع اکتوبر میں پنڈی چلا جاؤں اور ہاں کچھ دنوں نور چشم کرنل حسن رضا سلمہٗ کے یہاں آخر اکتوبر تک قیام کر کے لاہور میں کچھ دن گزاروں تا کہ ماہ مبارک رمضان سے پہلے کراچی واپس آ جاؤں اب آپ حضرات یہ چاہتے ہیں کہ مجھے ۲۶۔ ستمبر کو لاہور پہنچ جانا چاہیے میں آپ سب حضرات متعلقہ کے خلوص سے اس قدر متاثر ہوں کہ تعمیل ارشاد سے گریز کرنا گوارا نہیں وعدہ نہیں کرتا لیکن کوشش کرونگا کہ اپنے مجوزہ سفر کی الٹی چال کے مطابق پروگرام کو مرتب کروں فوراً مطلع ہونا چاہتا ہوں کہ میرے قیام کے بارے میں آپ نے کیا تجویز فرمایا ہے عرض کر چکا ہوں کہ میں عزیزم مسعود رضا سلمہٗ پر ان کی ناراضگی کی وجہ سے یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا کہ میں ان کے ساتھ ٹھہرنے سے گریز کر رہا ہوں سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹنے والا معاملہ ہے بہر حال

ان کو تفصیلات سے مطلع کر کے اور اپنی مجبوریاں سمجھا کر کوئی راستہ نکالنا مناسب سمجھتا ہوں جواب کا منتظر رہونگا۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔ وہاں سب حضرات کو میری تسلیم عرض کیجئے۔

احقر۔

آل رضا "

تینتالیسواں مکتوب

(۲۸۔ جنوری ۱۹۷۰ء)

ادارہ تنظیم الاسلام نے جناب زینبؑ کے حال میں یہ مرثیہ "شریکۃ الحسینؑ " کے نام سے شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ کتابت شدہ مسودہ میں نے استاد محترم کو بھیجا اور جب وہاں سے اغلاط سے پاک مسودہ آ گیا تو کتاب شائع کر دی گئی ان کی تحریر کردہ غلطیاں درست کر دی گئیں پہلے دس کتابیں کراچی ارسال کی گئیں بعد میں دس کتابیں اور بھی بھیج دی گئیں۔ نسیم امروہوی مرحوم فرماتے تھے کہ مجھے سید آل رضا کے مرثیوں میں یہ مرثیہ سب سے زیادہ پسند ہے۔

پروفیسر وزیر الحسن نے مسودہ دیکھ کر فرمایا کہ جناب زینبؑ کے خطبوں کو دیگر شعرا نے بھی نظم کیا ہے مگر جس خوبصورتی اور سوز وں ترجمے کے ساتھ سید آل رضا نے اردو زبان میں منتقل کیا ہے اسکی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔

" پی ای سی ایچ کراچی۔

۲۸۔ جنوری ۱۹۷۰ء

عزیز بگرامی قدر دلی دعا۔ نہایت عجلت میں یہ پوسٹ کارڈ لکھ رہا ہوں آج سہ پہر کو "شریکۃ الحسینؑ " کی دس کتابیں پہنچیں بہت بہت شکریہ۔

کم سے کم تین غلطیاں درست کرنے کے بعد کتابیں تقسیم کریں۔

۱۔ صفحہ ۵۷ بند ۵۳ بیت ...... قرض سے ہوشیار رہو۔

۲۔ صفحہ ۷۱ بند ۸۲ ...... روز روشن ہے اسیری ہے۔

۳۔ صفحہ ۷۷ بند ۹۳ ...... سامنا ہوگا جو صغرا کا تو کیا گزرے گی۔

صغرا میری ہی غلطی تھی کہ مسودے میں اسکی جگہ میں نے غیروں لکھ دیا تھا۔

اپنے یہاں میں نے یہ تینوں غلطیاں دور کردیں اور اب کتابیں کچھ لوگوں کو دونگا خواہش مند تو بہت ہوگئے فی الحال دس ہی سہی کل ایک مفصل خط لکھونگا۔ تبصرہ نگار حضرات کو میرا اسلام اور شکریہ پہنچا دیجئے گا۔ خدا کرے آپ لوگوں کی یہ طباعت کی کوشش کامیاب ہو ایک مرتبہ پھر غریب نوازی کا شکریہ۔

منت کش دعا گو۔

آل رضا"

چونتالیسواں مکتوب

(۱۳۔ جولائی ۱۹۷۰ء)

میں نے ۱۹۷۰ء میں مختصر مرثیے کے لئے ایک سوالنامہ جاری کیا تھا جس میں متعدد سوالات تھے میں نے چالیس پچاس بند کا تعین بھی کیا تھا اسی سوالنامے میں یہ بھی تحریر تھا کہ مسدس کے علاوہ بھی مرثیہ کسی فارم میں کہا جاسکتا ہے نیز کیا مرثیہ تحت اللفظ کی بجائے ترنم سے بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

سوالنامے کے علاوہ میں نے یوم آل رضا منانے کے متعلق بھی ان سے رائے مانگی تھی ان تمام باتوں کا جواب اس خط میں تحریر کیا گیا ہے۔

" ڈیفنس سوسائٹی کراچی۔

۱۳۔ جولائی ۱۹۷۰ء

عزیز محترم۔ سلامت خوش اور آباد رہئے۔ کل یعنی ۱۳۔ جولائی کو آپ کا تلطف نامہ موصول

ہو تحریر خط کی تاریخ ۸۔ جولائی لکھی ہے وہاں کے ڈاک خانے کی مہر پڑھی نہیں جاتی یہاں کی مہر میں ۱۳۔ جولائی صاف نظر آ رہی ہے۔

میاں یوم آل رضا کا قصہ چھوڑ یئے میں آپ سب حضرات کا بے حد ممنون ہوں کہ طرح طرح سے میری عزت افزائی فرماتے رہے ہیں۔ میرے نزدیک ہر وہ دن جب میں آپ لوگوں کے سامنے مرثیہ پیش کر کے آپ کے ذوق سماعت سے سرفراز ہوتا ہوں یوم آل رضا ہے اور ابتک ایسے کئی دن میرے زندگی میں آ چکے ہیں۔ میں اپنی مرثیہ گوئی کی یہی حد سمجھتا ہوں کہ جس طرح سے پیغام حسینی اپنی ناچیز حد تک سمجھ کر اپنے سامعین تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں وہ اسی طرح اور اسی دل سے سن لیا جائے خصوصاً ادبا اور فضلا کے مجمع میں جو وقت کے تقاضوں کی اقدار سے واقف ہیں۔ اور یہ وہ دولت ہے جو فیض سرکار حسینی کی بدولت مجھ ایسے حقیر شاعر کو بہت مل چکی ہے اور نہ معلوم کہاں کہاں اس حقیقت نے میرے دل کو ایسی طمانیت بخشی کہ غالباً مجھ سے وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کا کچھ فرض ادا ہو گیا اور یہ میرے لئے بہت بڑی بات ہے کہ مجھے یہ فخر اپنی زندگی ہی میں حاصل ہو گیا۔

سوالنامہ مل چکا ہے چاہا کہ فوراً بھیج دوں مگر دو لفظی مختصر نویسی سے کام نہ چلا میں اب وقت نکال کر جوابات تحریر کروں گا۔ مختصراً عرض کر دوں کہ مختصر مرثیوں کی تجویز مناسب ہے اور یہ رسم قدیم بھی ہے مرثیے کو اب بہر حال مسدس ہی میں ہونا چاہئے اسے ترنم سے بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہونگے ایک خط اس سے پہلے بھیج چکا ہوں آخری خط پر جدید پتہ لکھا تھا۔

دعا گو۔

آل رضا"

پینتالیسواں مکتوب

(۱۳۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء)

میں نے استاد محترم کے کارڈ پر بغور نظر نہیں ڈالی اور انھیں پرانے پتے ہی پر خطوط لکھے۔ میں نے ان سے گزارش کی تھی کہ رسالہ پیام عمل کے ماہ شعبان کی رعایت سے امام حسینؑ کے متعلق کوئی منقبت ارسال کر دیں۔ انھوں نے پرانے مرثیے میں سے تین بند بھیج دیے جنھیں شائع کر دیا گیا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے راحت حسین کا نام ناصر حسین کب اور کیوں لکھا راحت حسین ناصری سے میں استاد محترم ہی کے ذریعے سے واقف ہو چکا تھا میں نے یہ بھی تحریر کیا تھا کہ اگر راحت صاحب نے دوسرے حضرات کے سرقات پکڑے ہوں تو مجھے بھیج دیں مگر اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اب ان کے پاس مزید مواد نہیں ہے انھوں نے جتنا کچھ ارسال کر دیا ہے اسے پڑھ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

" پی ای سی ایچ کراچی۔

۱۳۔اکتوبر ۱۹۷۰ء

عزیز گرامی قدر۔ سلامت رہیے

تلطف نامہ مورخہ ۵۔اکتوبر مجھے آج ملا آپ نے پتہ غلط لکھ دیا تھا لہٰذا میں نے اس تحریر میں اپنا صحیح پتہ مکرر لکھ دیا ہے۔ آپ میرے دو آخری پوسٹ کارڈ پھر پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ آپ نے پہلی مرتبہ کچھ عجلت میں میرے وہ دونوں خط پڑھے تھے ورنہ اب پرانے پتے پر یہ کارڈ اور اس سے پہلے والا خط بھیجنے پر اصرار نہ کرتے۔ آپ کا اس سے پہلے والا لفافہ تو خیر کچھ جلد ہی مل گیا کیونکہ اسی وقت تک احمد نے وہ مکان چھوڑا نہیں تھا صرف میں ان کے یہاں سے سجاد رضا سلمہٗ کے یہاں منتقل ہو گیا تھا مگر اب تو ڈیفنس سوسائٹی والا مکان خالی پڑا ہے کل احمد میاں اتفاقاً ادھر سے نکلے یا ادھر سے ان کے پاس کوئی آدمی آیا تو یہ خط انھیں مل گیا۔

اب کچھ کہنے کا نہ موقع ہے اور نہ دماغ اس قابل رہا بہر حال اپنے پرانے مرثیے کے تین

بتدائی بند لکھ کر ملفوف کر رہا ہوں معلوم نہیں آپ کے کام کے ہیں یا نہیں۔

آپ غالباً راحت حسین ناصری صاحب کو ناصر حسین لکھتے ہیں بہت عرصہ ہوا کہ میں آپ کو یہ مطلع کر چکا تھا کہ آپ ان سے کچھ اور زیادہ توقع نہ کیجئے بہر حال آپ کا پیغام پہنچا دونگا۔ بہت کم ملاقات ہوتی ہے۔ میری طبیعت اس وقت خراب ہے کچھ لکھا نہیں جاتا۔ خدا حافظ امید کہ آپ مع الخیر ہونگے۔

آل رضا "

چھیالیسواں مکتوب

(۱۲۔ جولائی ۱۹۷۱ء)

میں نے جو سلام استاد محترم کی خدمت میں ارسال کیا تھا اسکا مطلع درج ذیل ہے۔

ہم اس نظام شریعت کے پاسدار نہیں
کہ جس نظام میں قاتل قصور وار نہیں

اور جس شعر پر اصلاح کی ہے وہ درج ذیل ہے۔

یزید جبر و تشدد سے جس پہ قابض ہے
وہ اقتدار کی میت ہے اقتدار نہیں

مصرع اولیٰ میں درج ذیل اصلاح کی ہے۔

جس اقتدار پہ نازاں ہوں پیروانِ یزید

اس مصرع میں حال والی کیفیت ختم ہوگئی۔

میں نے تحریر کیا تھا کہ میں اگست کے مہینے میں کراچی آکر آپ کی خدمت میں حاضری دونگا اسی کا ذکر اس خط میں کیا ہے۔

کراچی۔

۱۲۔ جولائی ۱۹۷۱ء

عزیزی و مکرمی تسلیم و دعا۔ بلکہ بہت بہت دعائیں

آپ کا سلام کامیاب کوشش کا مظہر ہے۔ مگر کئی جگہ ماضی کے بجائے حال کا صیغہ استعمال ہو گیا ہے۔ ایسا ہوتا ہے مگر اس کے خاص مقامات ہوتے ہیں۔ اب اس زمانے میں یہ باتیں کون دیکھتا ہے۔ خدا کرے رسالے میں آپ کا کلام خاطر خواہ پسند کیا جائے۔ محترمی نجم صاحب کو آپ لوگوں سے بہت خوش ہونا چاہئے جیسا کہ میں نے محسوس کیا ہے۔ میرے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ میری ایک لڑکی لاہور میں ہے دوسری کراچی میں وہاں بھی رہنا ہے اور یہاں بھی۔

میں ان کا بڑا مداح ہوں یہاں تو وہ آج کل طرحی غزلیں کہہ کر مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں خدا کرے آپ مع الخیر ہوں بشرط حیات میں اگست میں آپ کے آنے کا منتظر رہونگا۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ خدا حافظ

دعا گو۔

آل رضا"

سینتالیسواں مکتوب

(۱۰۔ ستمبر ۱۹۷۱ء)

میں نے سوال کیا تھا کہ دس محرم درست ہے یا دسویں محرم جبکہ عوام الناس نہ دس نہ دسویں کے الفاظ تحریر کرتے ہیں وہ تو تاریخ یعنی ۱۰ لکھ کر اس کے آگے محرم لکھ دیتے ہیں۔

استاد محترم نے اسی سوال کا جواب لکھ کر ڈاکٹر عابدی سے مشورہ کرنے کی ہدایت کی جب میں نے ڈاکٹر عابدی صاحب سے مشورہ کیا تو انھوں نے دس محرم کی بجائے ۱۰ محرم کو درست کہا

کیونکہ اب یہ غلط العام کے ذیل میں آتا ہے۔

" کراچی۔

۱۰۔ ستمبر ۱۹۷۱ء

عزیز گرامی قدر۔ تسلیم و دعا

دس اور دسویں کے متعلق اشعار کا سرسری جواب لکھ کر میں نے محترمی ڈاکٹر عابدی کی رائے سے اتفاق کا اظہار کیا تھا۔ مزید غور کرنے پر کچھ اور تفصیل کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ مہینہ لکھنے کے بعد پانچویں کے بعد سے " تاریخ کے بعد" ویں لگانا ثقات کی زبان پر ہے۔ عوام اس کا لحاظ نہیں کرتے مگر بات محتاط لوگوں کے نزدیک غلط العام کے درجے تک ابھی نہیں پہنچی جو اسکو بھی فصیح سمجھ لیا جائے۔

اب رہا مہینہ لکھنے سے پہلے تاریخ لکھنے کا سوال جیسے ۱۰ محرم (نہ کہ محرم کی دسویں) سو اسکے بارے میں غالباً مذکورہ عبارت صحیح نہ ہو یعنی دس محرم کہنے کو اگر قاعدے کی رو سے غلط کہا بھی جائے تو کم سے کم غلط العام ضرور ہے جو جائز سمجھ لیا جائے گا۔ اس تفریق کا لحاظ کر کے ڈاکٹر صاحب کی رائے سے مجھے مطلع فرمایئے گا۔ ممنون ہونگا۔

دعا گو۔

آل رضا "

اڑتالیسواں مکتوب

(۱۲۔ ستمبر ۱۹۷۱ء)

میں کراچی گیا اور واپس آ گیا استاد محترم سے نہ مل سکا۔ لاہور آ کر معذرت کا خط تحریر کیا اسی کا ان کے خط میں تذکرہ ہے میں نے اپنے خط میں ڈاکٹر عابدی صاحب کی علالت اور جناب نجم آفندی کی مصروفیت کا بھی تذکرہ کیا تھا۔ نجم آفندی کے درج ذیل شعر پر استاد محترم نے اعتراض

گیا ہے۔

اے آج کی اشتراکیت پہ نازاں
سلمان کی گورنری و مزدوری دیکھ

گورنر انگریزی زبان کا لفظ ہے اس لئے اس کے بعد واؤ عطف کا استعمال مناسب نہیں تھا نجم صاحب فرماتے تھے کہ گنگ اور جمن دونوں ہندی ہیں یہ گنگ و جمن کی ترکیب استعمال کرنے والے کوئی آسمان سے اترے تھے۔ جوش ملیح آبادی نے اپنے مرثیے میں پچھی ولا جوتی استعمال کیا ان سے کسی نے کیوں نہیں پوچھا کہ یہ کیا کر رہے ہو۔ طنز و مزاح میں اس قسم کی ترکیب کا استعمال قدما کے یہاں بھی ہوا ہے۔

استاد محترم سید آل رضا مرحوم اور نجم آفندی مرحوم دونوں میرے لئے قابل احترام تھے اس لئے اس سلسلے میں میری رائے میں کوئی وزن نہیں اکبر الہ آبادی نے مزاحیہ انداز میں "رنگ کالج" استعمال کیا شان الحق حقی نے اسی سند پر "آواز سنسناہٹ" استعمال کیا۔ حمایت علی شاعر جنہیں جوش مرحوم شاعر بچہ کہتے تھے آج اپنے کو عظیم شاعر کہتے ہیں اور درج شعر کہہ کر اپنے سر پر عظمت کا تاج رکھ کر دنیا میں اردو کو روشناس کر رہے ہیں۔

مگر وہ چھپ نہ سکا اور نذر ڈاک ہوا
فسانہ غم گیتی تھا رزق خاک ہوا

(افکار کراچی جولائی ۹۹ء)

ان کا قول ہے کہ زندہ دلان لاہور اور مسلمانان ہند میں اضافتیں کیوں ہیں جبکہ لاہور اور ہند دونوں ہندی کے الفاظ ہیں اب ان سے کون کہے کہ لاہور اور ہند اسم معرفہ جامد ہیں ان کے ساتھ اضافت کا استعمال جائز ہے ذاک اسم معرفہ نہیں۔ انشاء اللہ خاں انشاء نے درست ہی کہا تھا۔

کبھو اردو کو چت کر دوں کبھو اردو کو پٹ کر دوں
زباں داں اور ہوں گے ہم تو پنجابی رسالے ہیں

" پی۔ای۔سی۔ایچ۔کراچی۔

۱۲۔ستمبر ۱۹۷۱ء

عزیز گرامی قدر سلامت رہیے تلطف نامے کا شکریہ

افسوس ہے کہ آپ کو ناگہانی طور پر یہاں سے لاہور واپس جانا پڑا۔ آخری ملاقات کے بعد میں دو تین دن تک منتظر رہا۔ مگر پھر یہی سمجھ لیا کہ غالباً آپ نے مراجعت فرمائی اپنے کسی مخلص کرم فرما سے ملاقات ہو جانا اپنے لئے غنیمت سمجھتا ہوں نہ جانے کب آنکھ بند ہو جائے کب تک زندہ رہونگا۔

خدا کرے آپ اچھے ہوں اور وہاں کے میرے اور مہربان بھی۔ بوقت ملاقات سب کو میری تسلیم کہہ دیجئے گا۔ محترمی نجم آفندی صاحب کو بھی میرا سلام کہہ دیجئے گا۔ اور مزاج پرسی کر دیجئے گا ان کا لاہور میں قیام آپ حضرات کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہوگا اور موجب استفادہ بھی۔ جناب ڈاکٹر عابدی صاحب کی تکلیف کا حال سن کر مجھے بڑی کوفت ہوئی خدا کرے علاج سے خاطر خواہ فائدہ ہو چلا ہو۔ لاہور سے جو رسالہ آتا ہے اس میں نجم صاحب کا وہ ایک قطعہ ضرور شائع ہوتا ہے جس میں موصوف نے گورزی و مزدوری استعمال کیا ہے کیا گورزی کو فارسی کا لفظ سمجھا جائے۔ یہ عابدی صاحب سے دریافت کیجئے گا۔ یہ اعتراض نہیں بلکہ صرف اپنے علم میں اضافے کے خیال سے پوچھتا ہوں۔ خدا حافظ

دعا گو۔

آل رضا "

انچاسواں مکتوب

(۲۳۔ستمبر ۱۹۷۱ء)

بعض شعرا ہندی الفاظ کی ترکیب میں اضافت کا استعمال کر رہے ہیں مثلاً آواز سنسناہٹ (شان الحق حقی) اسی طرح عطف کا استعمال بھی ہندی الفاظ میں کیا جا رہا ہے۔ مثلاً شور و غل یا

رعب وداب وغیرہ میں نے استاد مرحوم سے ان تراکیب کے بارے میں استفسار کیا تھا اس خط میں مرحوم نے دونوں تراکیب کو غلط بتایا۔

جناب نجم آفندی کے درج ذیل مصرعے میں دس کا لفظ استعمال ہوا ہے جبکہ دسویں ہونا چاہیے تھا۔

اس چاند کی دس کو سانجھ تلک شبیر سے دنیا خالی تھی

استاد مرحوم کے خیال میں دس کی جگہ دسویں ہونا چاہیے تھا اگر یہ کسی ہندی نوحے کا مصرع ہے تو پھر عربی کے الفاظ استعمال نہ ہونے چاہیے تھے۔

استاد مرحوم کے نزدیک کربلا اسم جامد ہے اور ایک جگہ کا نام ہے کرب وبلا کی ترکیب مناسب نہیں۔

" کراچی۔

۲۳۔ستمبر ۱۹۷۱ء

عزیز گرامی قدر تسلیم و دعا محبت نامے کا شکریہ

سلام ابھی تک نہیں پہنچے ظاہر ہے اب تو وقت ہی نہ رہا۔حرف عطف کسی ایک اُردو لفظ کے پہلے یا بعد میں نہ لانا چاہیے۔دس کے لفظ کے بارے میں مجھے ڈاکٹر عابدی صاحب کی رائے سے اتفاق ہے دسویں ہونا چاہیے تھا لغات کے لحاظ سے۔عوام اسکا لحاظ نہیں کرتے چاند اور دس اردو۔دنیا اور خالی عربی۔ان کے درمیان میں سانجھ ٹھیٹھ ہندی لفظ کا استعمال نامناسب ہے اور اگر یہ کسی ہندی نوحے کا مصرع ہے تو اس میں عربی کے الفاظ کا استعمال مناسب نہیں جناب آرزو مرحوم نے "سریلی بانسری" کے نام کے مجموعے میں انھیں باتوں کی تبلیغ کی ہے۔یعنی صرف وہ خالص اُردو الفاظ استعمال کیے ہیں جو ہندی سے اُردو میں لے لیے گئے ہیں سانجھ کا مترادف اُردو میں شام ہے مگر شام ہے فارسی لفظ لہٰذا آرزو صاحب کے خالص اُردو والے مجموعۂ کلام میں نہ سانجھ کا لفظ استعمال ہوا ہے نہ شام کا اور فارسی کے الفاظ سے احتراز کیا گیا ہے۔

کربلا ایک خاص جگہ کا نام ہے میں اسی معنی میں کرب و بلا کا استعمال صحیح نہیں سمجھتا بعض لوگوں کو اس نامناسب طریقے میں الجھا ہوا پایا ہے مگر بہت کم مستند قدما نے بھی اس سے احتراز کیا ہے۔

خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔ میری طبیعت حسب معمول گری ہوئی رہتی ہے خدا کا شکر ہے کہ چل پھر رہا ہوں اس عمر میں شکایتوں کا کیا خیال کیا جائے۔ خدا حافظ۔

دُعاگو۔

آل رضا "

پچاسواں مکتوب

(۲۶۔ ستمبر ۱۹۷۱ء)

میں نے استاد محترم کو ایک سلام برائے اصلاح روانہ کیا تھا اور درخواست کی تھی کہ ۲۷۔ ستمبر تک واپس ہو جائے تو میں مسالمے میں پڑھ دوں مگر اصلاح شدہ سلام ۲۷ تک نہ پہنچا لہٰذا میں نے بغیر اصلاح شدہ سلام پڑھ کر کافی داد وصول کی۔ آخری شعر یہ تھا۔

جس کے ہونٹوں میں نہیں الفت حیدر کی مٹھاس
بات کیا سانس بھی اس شخص کی زہریلی ہے

استاد محترم نے حیدر کی مٹھاس کی جگہ شبیر کا رس کر دیا اور اس تبدیلی کی وجہ خط میں درج کر دی۔

" کراچی۔

۲۶۔ ستمبر ۱۹۷۱ء

عزیزم سلامت رہیے

آج ستمبر کی چھبیسویں ہے پرسوں یعنی چوبیسویں کی شام کو آپ کا لفافہ موصول ہوا تھا ایک

دن پہلے آپ کو ایک پوسٹ کارڈ روانہ کر چکا تھا جس میں یہ تحریر کیا تھا کہ اب سلام کی اصلاح کرنے اور وقت سے وہاں واپس پہنچانے کی صورت باقی نہیں رہی چنانچہ وہی ہوا۔

زہر تو مٹھاس میں ملا کر بھی کھلا دیا جاتا ہے۔ اس لئے میں نے الفتِ شبیر کا رس کر دیا ہے۔

دعا گو۔

آل رضا "

اکیاون واں مکتوب

(۴۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

کتاب " پانچ مختصر مرثیے " تصنیف کردہ سہیل بخاری مرحوم کے صفحہ ۱۲ پر مختصر مرثیے کا ذکر کرتے ہوئے میں نے درج ذیل جملہ تحریر کیا ہے۔

" کبھی کبھی تو ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ فقط ایک چھوٹا مگر اہم واقعہ یا کرداری ذہنی کیفیت ہی مختصر مرثیے کے لئے بہت ہے آل رضا' جوش اور مظہری کے یہاں فکری عنصر مرثیوں کی زینت تو بنے ہیں لیکن نفسیاتی عناصر کم سے کمتر ہوتے چلے گئے"

میں نے جدید نفسیاتی عناصر مثلاً کشمکش انا' خودداری' خود فراموشی' عصبیت' جنسیت وغیرہ کی طرف اشارہ کیا تھا مگر استاد مرحوم نے بچوں' بوڑھوں جوانوں اور عورتوں کی جبلت اور خصائل کو پیش نظر رکھ کر بحث کی ہے میں تو ان کا مطلب اور مقصد سمجھ گیا مگر وہ میرا مطلب نہ سمجھ پائے۔ مجھ سے میرے بیان کی توضیح طلب کرنے کے لئے یہ خط تحریر کیا۔

• میں نے کرب و بلا کی ردیف کے ساتھ ایک سلام کہا جو اس وقت کتاب " تشنہ لب ہے حسین " میں موجود ہے مگر اصلاح کے لئے اس وجہ سے نہیں بھیجا کہ وہ اس ترکیب کو اچھا نہیں سمجھتے۔ مجھے اس امر پر شدید حیرت ہے کہ مرحوم نے خود اپنے ایک مرثیے میں یہ ترکیب استعمال

کی ہے جو ملک کے معنوں میں ہے۔

فاتح کرب و بلا شام کو سر کر کے چلے

(مراثی سید آل رضا ص ۳۳۵)

" پی۔ای۔سی۔ایچ۔کراچی۔

۴۔اکتوبر ۱۹۷۱ء

عزیز محترم سلامت رہیے

تلطف نامہ مورخہ ۲۹۔ستمبر کا شکریہ۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ اچھے ہیں میں نزلے میں بری طرح مبتلا ہوں مگر میرے لئے تو اب یہی رہ گیا ہے خدا انجام بخیر کرے۔ دعا کا طالب ہوں۔

جناب نجم آفندی کا میں بہت احترام کرتا ہوں۔ موصوف نے زبان اور عروض کے بارے میں جو کچھ آپ سے ارشاد کیا اسے معلوم کر کے حیرت ہوئی خیر جانے دیجئے۔ جو میں نے سمجھ رکھا ہے وہ میرے لئے ٹھیک ہے آپ کا شعر "پی لی ہے" ایسا تھا کہ میں اسے سمجھا ہی نہیں بلکہ جو کچھ قیاس کر لیا تھا وہ اب آپ کی تشریح کے بعد بالکل غلط نکلا۔ موضوع شعر جو آپ کے ذہن میں ہے وہ میرے خیال سے اس طرح میں مناسب طریقے سے ادا ہو ہی نہیں سکتا اور یوں بھی خلاف واقعہ ہے۔ ہم پر کب یہ تہدید ہے کہ ہم شہ مظلوم کی مدح خوانی نہ کریں اور سنی حضرات میں ایسے مدح خواں ابھی موجود ہیں جو یہ شرف حاصل کرتے رہتے ہیں۔ بہت زیادہ نہ سہی مگر ہیں ضرور کراچی میں تو بہت ہیں۔ بہرنہج اگر وہ مضمون کہنا ہی ہے تو شاید پہلا مصرع یوں بہتر ہوگا کہ "مدح خوان شہ دیں تم بھی تھے لیکن اے دوست" دوسرا مصرع اسی طرح جیسا کہ آپ نے کہا ہے یعنی "ہم پہ تہدید ہے کیوں تم نے زباں سی لی ہے"۔ اس طرح میں جہاں کربلا کی جگہ کرب و بلا کی ردیف ہے آپ نے اپنا سلام میرے پاس نہیں بھیجا تو بہت اچھا کیا۔ میں اس ترکیب سے احتراز کرتا ہوں۔

نیا مطبوعہ پانچ مختصر مرثیے سہیل بناری موصول ہوا۔ آپ حضرات کی تجویز کو اس قدر جلد عملی جامہ پہنا دینا جناب موصوف کے ایسے کہنہ مشق مداح اہلبیت ہی کا کام تھا آپ لوگوں نے جس وقتی اور

غالباً مقامی ضرورت کو محسوس کر کے اس امر پر اصرار کیا تھا اسکی ایک اچھی خاصی شکل آپ کے سامنے ہے امید ہے کہ اور حضرات کی بڑی ہمت افزائی ہوگی جو تیس چالیس بند سے زیادہ کہنا طول عمل سمجھتے ہونگے خدا کرے کہ اس سعی مشکور کے اچھے نتائج برآمد ہوں۔ نئے شعرا کے لئے بھی اور اس تعداد سے زیادہ نہ سننے والے سامعین کے لئے بھی۔

میں نے آپ کا تبصرہ بھی پڑھا اس امر سے مجھے کامل اتفاق ہے کہ رثائیت کے بغیر کسی مسدس کو مرثیہ کہنا زبردستی ہے بلکہ برائے نام رثائیت کے شمول سے بھی مسدس مرثیہ نہیں بن جاتا۔ خود اپنے کہے ہوئے مرثیے کا ایک بند تحریر کرتا ہوں جو آپ کی نظر سے گزر چکا ہے یہ مجلس کے متعلق ہے۔

جہاں ہے نعرۂ جرأت فغان درد بھی ہو ہے اس جگہ کا تقاضا بیان درد بھی ہو

جو ہے حدیث وفا داستان درد بھی ہو جہاں ہیں فخر کی باتیں زبان درد بھی ہو

بیان یوں تو مسدس میں کیا نہیں ہوتا

جہاں یہ درد نہ ہو مرثیہ نہیں ہوتا

اب علی الاعلان یہ کہنے اور منبر سے بارہا پڑھنے کے بعد جب اس نئے مطبوعے میں آپ کے نقد و تبصرہ کا یہ جملہ پڑھتا ہوں کہ۔

آل رضا کے یہاں فکری عنصر مرثیوں کی زینت تو بنے ہیں لیکن نفسیاتی عناصر کم سے کم ہوتے چلے گئے ہیں۔

تو اپنے اوپر بڑا افسوس معلوم ہوتا ہے یہ الفاظ پڑھ کر میں نے بجلی کا ایک جھٹکا سا محسوس کیا۔ کیا لاہور کے ہوشمند سامعین نے میری متعدد مجالس سننے کے بعد میرے متعلق یہی رائے قائم کی ہے اگر ایسا ہے تو انھوں نے اپنی گفتگو اور تحریری تبصروں سے مجھے خواہ مخواہ ایک سخت غلط فہمی میں کیوں مبتلا کر رکھا ہے جس کا انکشاف اب ہوا۔

خیر میاں اب تو میرا یہ سفر تقریباً ختم ہی ہو چکا ہے اب تو کچھ اور کہہ کر اپنی اس مفروضہ کوتاہی کی تلافی کرنے کا موقع ہی نہیں رہا۔ یہ آپ سے کوئی ذاتی شکایت نہیں ہے۔ آپ نے اپنی رائے کا

اظہار صفائی اور جرأت کے ساتھ کردیا اور میں نے اسکے متعلق اپنا معروضہ پیش کردیا جو ضروری تھا تاکہ آپ ہی کے ذریعے سے اور حضرات بھی مطلع ہو جائیں کہ مجھے فی الحال آپ کی مذکورہ بالا رائے سے قطعاً اختلاف ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کی مزید نشاندہی سے قائل ہو جاؤں۔ معقول بات کو سمجھ بوجھ کر نہ ماننا بڑی اخلاقی کمزوری ہے۔ چاہتا ہوں کہ کم سے کم جناب مرتضیٰ حسین صاحب اور جناب ڈاکٹر عابدی صاحب کے تاثرات سے بھی مطلع ہو جاؤں۔ جس کے بعد خود اپنے تاثرات کی اصلاح کرنے کی کوشش کروں۔ جواب کا منتظر رہونگا۔

خدا حافظ۔

آل رضا''

باون واں مکتوب

(۱۳۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

میں نے ۴۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء کے خط کے جواب میں بالتصریح یہ تحریر کیا کہ آپ کو جس جملے سے تکلیف پہنچی اس سے قبل یہ جملہ ہے جو میرے خیال کو واضح کر رہا ہے۔

''کبھی کبھی تو ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ فقط ایک چھوٹا مگر اہم واقعہ یا کسی کردار کی ذہنی کیفیت ہی مختصر مرثیے کے لئے بہت ہے'' (۵ مختصر مرثیے ص ۱۲)۔

میں نے مثال میں کربلا کے مختلف واقعات کا ذکر بھی کیا شعرائے قدیم اور شعرائے جدید نے واقعات کا ذکر کیا ہے مگر ذہنی کیفیات کا جائزہ کم لیا ہے۔

میں نے جناب سہیل بناری کے بارے میں یہ تحریر کیا کہ انھوں نے مرثیے میں اختصار مدنظر رکھ کر ایک کوشش تو کی ہے مگر:۔

''چونکہ موصوف کی یہ کوشش اوّل ہے اس لئے ہم ان سے اس سے زیادہ کی توقع نہیں کرسکتے تھے''۔ (۵ مختصر مرثیے ص ۱۳)۔

یہ جملہ خود بتا رہا ہے کہ ابھی مختصر مرثیے کے لئے جس تکنیک کی ضرورت ہے وہ پوری نہیں ہوئی صرف اختصار کی صفت مکمل ہوگئی۔ میں نے یہ بھی تحریر کیا کہ آپ کا یہ مصرع ڈرامائی کیفیت اور نفسیاتی عنصر کے ذیل میں آتا تو ہے مگر یہ ایک مصرع مکمل مرثیے کے ذیل میں نہیں آتا۔" اصغر کی لاش مادر اصغر کا سامنا"۔ میرا مقصد یہ ہے کہ کم سے کم شاعر جب رثا کی منزل میں قدم رکھے تو وہ درد آمیز اور درد آموز بیان سے سامعین کی ذہنی کیفیت کو اتنا متاثر کرے کہ وہ عرصے تک اس کیفیت سے باہر نہ نکل سکیں۔ مگر افسوس ہے کہ استاد مرحوم کو میری یہ وضاحت مطمئن نہ کر سکی۔

" کراچی۔

۱۲۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء

مجھی سلامت رہئے۔ لفافہ پہنچا آپ کی توضیح نے تو میرے نزدیک معاملے کو اور الجھا دیا اور نتیجہ یہ ہے کہ میں وہ کچھ نہ سمجھا سکا جو سمجھانا چاہتا تھا مگر اس الجھاؤ کے باوجود اب بھی میں سمجھنا چاہتا ہوں یعنی وہ نفسیاتی یا کسی اور نام کے عناصر کیا ہیں جو میرے مرثیوں میں ظاہر ہوئے لیکن کم سے کمتر ہوتے چلے گئے اگر ظاہر ہی نہیں ہوئے تو بقیہ جملہ بے معنی ہو کر رہ جائے گا کیونکہ پھر ہونا یہ چاہئے تھا کہ یہ بات یہاں بے ہی نہیں اور پھر میں آپ سے یہ دریافت کرتا کہ وہ بات کیا ہے جو مرثیے کی خوبی کے لئے ہونا چاہئے تھی مگر مجھ سے نظر انداز ہوئی ہے۔ آپ کے پاس میرے چار مطبوعہ مرثیے ہیں میں ان کے حوالے سے امر مذکور کو سمجھنا چاہتا ہوں اور ممنون ہونگا اگر مجھے استفادے کا موقع دیجئے یہ گفتگو فن اور ادب کے متعلق ہے اور ہم دونوں کو اپنے خیالات کا اظہار آزادانہ کرنا چاہئے مختصر افسانے میں جس طرز گویائی کی خوبی کا ذکر آپ نے کیا ہے وہ کیا صرف ضرورتاً یعنی اختصار کی مجبوری کی وجہ سے پیدا کی جاتی ہے یا اصل میں اپنی جگہ کوئی ایسی خوبی ہے کہ جہاں ظاہر ہو قابل تعریف سمجھی جائے؟ بہر حال میں اپنی جانب سے آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے کبھی ایسی کوئی چیز بھی محسوس نہیں کی جو ابتداء میں تو کامیابی کے ساتھ ظاہر کر دی مگر بعد کو اس سے قاصر ہو گیا یا ہوتا چلا گیا۔ ایک بات اور ہے کیا آپ کے سوالنامے

میں کہیں اس جانب کوئی اشارہ بھی ہے کہ مختصر مرثیہ اس خصوصیت کا ہونا چاہئے اور جب آپ نے یہ پانچ مختصر مرثیے شائع کیے تو اس کا کہیں کوئی ذکر آیا کہ یہ مرثیے اس معیار کو مطلق پورا نہیں کرتے جو اس تحریک کی بنا ہے؟ یہ اور بات ہے کہ ان مرثیوں کو ابتدائی کوشش کہا جائے لیکن کیا وہ کوشش فی الحال ناکامیاب سمجھی جائے۔ اسی لئے اب اگر آپ نے اس کا نام نفسیاتی مختصر مرثیہ رکھا تو ان مرثیوں کا اس سلسلے میں شائع کرنا فعل عبث ہو جائے گا۔ مجھے اپنی ہتک کا خیال نہیں ہے اگر کوئی بات مجھ سے قابل اعتراض سرزد ہوئی تو اسکی نشاندہی میں کیا مضائقہ ہے امید ہے میرا سابق پوسٹ کارڈ پہنچ گیا ہوگا جس میں میں نے اپنے خیالات کا ایک خاکہ پیش کر دیا ہے آپ نے مختصر مرثیہ اور مختصر افسانہ کا فرق بھی ظاہر کیا ہے۔ خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

دعا گو۔

آل رضا"

ترپن واں مکتوب

(۱۷۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

یہ خط اسی خط کا تسلسل ہے جو استاد محترم نے ۱۲۔ اکتوبر ۷۱ء کو تحریر کیا ہے۔ میں نے اپنے وضاحتی خط میں انھیں تحریر کیا تھا کہ نفسیاتی عناصر سے میرا مقصد جدید نفسیاتی عناصر ہیں جو سائیکلوجی کی تمام اہم کتابوں میں بالتفصیل درج ہیں اس کے علاوہ آپ نے شاید کتاب پانچ مختصر مرثیے کے صفحات ۸-۱۱-۱۳-۱۴ پر غور نہیں کیا جن میں میں نے صراحت سے بیان کیا ہے کہ سوز خوانی کے مختصر مرثیے تو ہیں لیکن انھیں مختصر مرثیہ اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رقت کا سامان تو فراہم کرتے ہیں مگر ذہنوں کی الجھی ہوئی گتھیوں کو نہیں سلجھاتے۔ جس قدر شدت کی فنکاری مختصر مرثیے کے لئے مطلوب ہے ان مرثیوں کے لئے نہیں میں نے یہ بھی تحریر کیا کہ مختصر مرثیوں کا طویل مرثیوں سے اس طرح کا تعلق نہیں جس طرح مختصر افسانوں کا افسانوں کے ساتھ ہے لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ میرے وضاحتی بیان سے مطمئن نہیں ہوئے اور مختصر

مرثیے کو تعدادی کے لحاظ سے پرکھتے رہے۔

انھوں نے اب تک جتنے خطوط تحریر کئے ان میں اختتام پر اپنے نام سے قبل والسلام کا لفظ استعمال نہیں کیا یہ پہلا خط ہے جس میں آل رضا سے قبل والسلام کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ لفظ بڑا معنی خیز ہے اور بتلا رہا ہے کہ میری توضیح انھیں پسند نہیں آئی اور ان کے ذہنی تحفظات کے مخالف ہے۔

" کراچی۔

۱۷-۱ اکتوبر ۱۹۷۱ء

عزیز محترم سلامت رہئے۔ آپ کا خط مورخہ ۔ اکتوبر تو ملا مگر وہ لفافہ موصول نہ ہوا جس کا ذکر اس خط میں ہے میں نے آپ کا تبصرہ پھر پڑھا اور وہ بات سمجھنے کی کوشش کی جو آپ نے اب لکھی ہے مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔ بہر حال وہ چیز نفسیاتی ہو یا فکری مگر کوئی متوقع خوبی تھی جو میرے مرثیوں میں آپ کے نزدیک کم سے کمتر ہوتی چلی گئی اس لئے اپنے استفادے بلکہ یوں کہوں کہ اپنی برخود غلطی کے لئے سمجھنا چاہتا ہوں اور اسی کے متعلق مکرمی عابدی صاحب اور مولانا مرتضیٰ حسین صاحب کی رائے سے بھی مطلع ہونا مقصود ہے مگر آپ ہی کے ذریعے سے یہ میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ مجھے آپ سے کوئی ذاتی شکایت لاحق نہیں ہے یہ ایک فنی اور ادبی معاملہ ہے اب میں اپنا خیال ذرا واضح کرنا چاہتا ہوں۔ انجمن شعرائے اہلبیت کی جانب سے لاہور کے بعض حضرات نے جو سوالنامہ مختصر مرثیہ نگاری کے متعلق جاری کیا تھا اس کا عملی جواب سہیل صاحب نے اپنی کہنہ مشقی اور مداحی اہلبیت کے ذوق کو بروئے کار لاکر نہایت قلیل مدت میں پانچ مرثیے کہے جو قابل تعریف سعی مشکور کہے جانے کے قابل ہیں میں نے بھی آپ کے سوالوں کے جواب میں تحریر کیا تھا کہ مختصر مرثیہ ضرور ہو سکتا ہے مگر یہ مختصر مرثیہ نگاری اور مرثیہ خوانی ہوتی بھی رہی ہے یہ بات وقت اور مذاق اہل مجلس پر منحصر ہے سہیل صاحب نے دل اور دماغ دونوں سے باتیں کی ہیں میری تو یہی گزارش ہے کہ طویل مرثیوں کے مختصر ٹکڑے برابر پڑھے جاتے ہیں

رکوئی تشنگی محسوس نہیں ہوتی میں خود اپنے متوسط قسم کے مرثیوں کے جو آج کل کا طریقہ ہے (طویل مرثیے میں نے شاید کہے ہی نہیں ہیں) اکثر ٹکڑے وقت اور موقع کے لحاظ سے ان مجلسوں میں پڑھے ہیں جو خاصی کامیاب سمجھی گئیں۔ ٹیلی وژن یا ریڈیو پر تو پچیس تیس بند سے زیادہ پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ نے بارہا یہ دیکھا کہ قدما کے بڑے طویل مرثیوں کے بعض ٹکڑے لے کر مختصر مرثیہ بنا کر حاگیا مگر بھائی یہ سب وقت اور موقع کے لحاظ سے تھا نہ کہ طویل مرثیوں کی اصلاح کے لئے۔ متوسط قسم کے مرثیوں میں جو میں نے کہے ہیں کوئی فضول بات محض حسن شاعری کے لئے نہیں کہی اس میں اگر پ کو کوئی کمی نظر آئی تو وہ میری طرز گویائی کا قصور ہے نہ کہ مختصر مرثیہ نہ کہنے کا۔ وہی کمزوری میرے مختصر مرثیوں میں بھی ظاہر ہو کر رہے گی۔ میرے خیال میں آپ نے مختصر مرثیوں کی وکالت میں ذرا مبالغہ سے کام لیا ہے یہ امر مسلمہ ہے کہ ہماری قابل ذکر مجلسوں میں دل اور دماغ دونوں سے آگاہی ہوتی ہے۔

والسلام

دُعا گو۔

آل رضا"

چون واں مکتوب

(۲۶۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

یہ خط میرے اس خط کے جواب میں ہے جس میں میں نے وضاحت کی تھی کہ نفسیاتی رو سے میری مراد جدید نفسیاتی عناصر ہیں جن کی ہمارے قدیم مرثیوں میں کمی ہے میں نے یہ بھی تحریر کیا کہ ہماری درخواست پر جناب سہیل بناری نے پانچ مرثیے کہہ تو دیے مگر:۔
چونکہ موصوف کی یہ کوشش اوّل ہے اس لئے ہم ان سے اس سے زیادہ کی توقع بھی نہیں کر سکتے تھے (پانچ مختصر مرثیے ص ۱۳)

میں نے اسی خط میں یہ بھی تحریر کیا کہ آپ میرے اس جملے کو بغور پڑھیں تو اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ میں ابھی تک بشمول (پانچ مختصر مرثیے) فنِ مختصر مرثیہ نگاری سے مطمئن نہیں۔

"اگر چابکدستی سے کام لیا گیا تو مختصر مرثیے اردو ادب میں ایک خاص مقام پیدا کر سکتے ہیں"۔ (پانچ مختصر مرثیے ص ۱۲)۔

میں نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ کبھی کبھی دو چار مصرعے بڑی بڑی منقبتوں اور بڑے بڑے مرثیوں پر بھاری ہوتے ہیں معین الدین چشتی کے چار مصرعے یا سعدی شیرازی کے چار نعتیہ مصرعے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ میں نے اس دور کے ایک شاعر عظیم قریشی کے جن کا مختصر نگاری میں بڑا نام ہے چار مصرعے تحریر کیے اور لکھا کہ دیکھیے واقعات کربلا کے منظر میں امام حسینؑ کا کردار کس خوبی اور بلاغت سے پیش کیا گیا ہے۔

مرگ سے کھیلا ایک تاثر
خنداں خنداں شاداں شاداں
فطرت گم سم حیراں یزداں
اور بشر سے اب کیا ہوتا
(عظیم قریشی)

استادِ محترم کے خط میں ان مصرعوں کا پوسٹ مارٹم موجود ہے حیرت اس امر پر ہے کہ استادِ محترم نے بارہا علامہ اقبال کا یہ مصرع پڑھا ہوگا۔

یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

" کراچی۔

۲۶۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء

عزیز گرامی قدر۔ دعائیں کل شام کو آپ کا پوسٹ کارڈ ملا دو پہر کو میں خود ایک پوسٹ کارڈ آپ کو لکھ چکا تھا بھائی آپ اپنے مختصر مرثیہ کے معاملات خود بہتر سمجھتے ہیں مجھے تو یہ معلوم ہوا کہ کہیں آپ

مختصر افسانوں میں ان کی Suspense والی کیفیت کی خوبی کو اپنے مختصر مرثیوں کے لئے نامناسب اور مخالف خیال کرتے ہیں اور کہیں انھیں ان میں مختصر افسانوں کے نفسیاتی خانہ کو مختصر مرثیے کے لئے طرۂ امتیاز بنتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں اس کے علاوہ سہیل صاحب کے کہے ہوئے پانچ مرثیوں کو مختصر مرثیوں کے نمونے کی طرح پیش کر کے اسکی مدح کرتے ہیں کہ یہ کامیاب کوشش ہے اور پھر یہ کہتے ہیں کہ آپ نے موصوف کو نفسیاتی مختصر مرثیے کا شاعر ہی نہیں مانا ہے معیاری ہونا اور بات ہے غالباً اسی سلسلے میں آپ کو یہ بھی ضرورت محسوس ہوئی کہ بیس سے تیس بند تک والے مرثیے سے زیادہ بند کہنے والے جدید مشہور شعرا (جس میں مجھے بھی شامل کیا ہے) اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ ان کے یہاں نفسیاتی عناصر کم سے کم تر ہوتے چلے گئے ہیں جس کے یہ معنی ہوئے کہ پہلے مذکورہ خوبی تھی پھر کم سے کم تر ہوتی چلی گئی مگر اب بھی کچھ باقی ہے ورنہ آپ یہ لکھتے کہ آخرکار بالکل غائب ہو گئی چنانچہ میں نے آپ سے صرف اپنے متعلق یہ دریافت کیا کہ وہ واقعی کیا چیز ہے اور کس طرح اس پر کمی کے مرض کا شدید حملہ ہوتا چلا گیا۔ میں صرف اسی کے جواب کا منتظر ہوں آپ کے پاس میرے چار مطبوعہ مرثیے ہیں انھیں کے اجزا کے حوالے سے یہ بات میری سمجھ میں آسکتی ہے اور ایک دیرینہ غلطی دور ہو جائے گی اسی کے ساتھ یہ بھی جاننا چاہونگا کہ اگر میں نے کم بند کہے ہوتے تو وہ خرابی دور یا بہت کم ہو کر رہ جاتی ورنہ پھر وہ طرزِ گویائی کا قصور ہوتا نہ کہ مسدس کی تعداد کا۔

عظیم قریشی صاحب کی مذکورہ شاعری میری سمجھ میں نہ آئی واقعات کربلا کی رثائی کیفیت اور خنداں خنداں شاداں شاداں۔ فطرت گم سم کیا شے ہے اور یہ یزداں کون ہے جو ششدر رہ گیا بہرحال میرے ذوق کے بالکل خلاف ہے۔ ہوگی یہ کوئی خوبی جو اور حضرات کو مبارک ہو۔

احقر۔

آل رضا۔"

پچپن واں مکتوب

(۹ نومبر ۱۹۷۱ء)

میں نے بڑی تفصیل سے اور پوری وضاحت سے دلائل اور حوالے دے کر استاد مرحوم کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ مختصر مرثیے میں فقط اختصار ہی مدِ نظر نہیں ہونا چاہئے بلکہ یہ انسان کی کسی معمولی اور ہلکی سی ذہنی کاوش یا خلش کو بھی چالیس پچاس بند میں بیان کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ اس کا دامن رثا سے خالی نہ ہو کیونکہ مرثیہ اہلِ مجلس کے سامنے پیش کرتا ہے جو فضائل و مصائب اہلبیتؑ سننے کے لئے آئے ہیں یہ کام مرثیوں کے ٹکڑوں کو جوڑ کر نہیں ہو سکتا۔ اس میں ابتدائیہ مرثیے کا پس منظر بیان کرے کلائمکس میں اصل مقصد کا نچوڑ ہو اور اختتامیہ میں وہ تاثر ہو جو دل کو گرما کر گداز بنا دے اور انسان بکا پر مجبور ہو جائے مجھے کسی مرثیے کے ٹکڑوں میں یہ تینوں مراحل ایک جگہ نہ مل سکے۔ میری یہ وضاحت بھی استاد مرحوم کو قائل نہ کر سکی چنانچہ اس خط میں بھی انھوں نے وہی سوال اٹھایا ہے۔

پی۔ای۔سی۔ایچ۔ایس کراچی۔

۹۔نومبر ۱۹۷۱ء

عزیز محترم دلی دعائیں

امید ہے کہ آپ مع متعلقین بخیر و عافیت ہوں گے مجھے جس بات کے جاننے کی فکر ہے آپ کو اسے ظاہر کرنے کو مجھے مستفیض ہونے کا موقع دینے سے کچھ احتراز معلوم ہوتا ہے ارے میاں یہ ادبی اور فنی موضوع پر تبادلۂ خیال ہے اس میں کوئی تکلف کیوں ہو۔ آپ کو میرے مرثیوں میں ایک کمی کی قباحت معلوم ہوئی میں اسی کو سمجھنا چاہتا ہوں اور ڈاکٹر عابدی صاحب اور مولانا مرتضیٰ حسین صاحب کی رائے بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں مگر آپ ہی کے ذریعے سے۔

یہ عریضہ ایک خاص صورت سے لکھ رہا ہوں غزل معلی کی چار سو جلدیں میں کسی کار خیر کے لئے نذر کرنا چاہتا ہوں قیمت فی جلد پانچ روپے ہے فروخت کرنے والے کو اختیار ہو گا کہ وہ جس دام چاہے نکال کر فائدہ حاصل کرے مگر یہ اسی کا کام ہو گا کہ کراچی سے لاہور منگوائے اور بہت جلد۔ امامیہ مشن کا پیام عمل میرے سامنے ہے اس وقت اسی کو دیکھ کر یہ خیال آیا ادارۂ تنظیم الاسلام کو بھی حقدار سمجھتا

ہوں یہ فیصلہ آپ کرلیں کہ اگر یہ ادارے جلدیں لینا چاہیں تو انھیں کس حساب سے تقسیم کی جائیں غالباً پ امامیہ مشن کو ترجیح دیجئے ادبی کتابیں یوں بھی نہیں نکلتیں جب تک کوئی خاص چیز محرک نہ ہو۔ امامیہ مشن یہ مشتہر کرسکتا ہے کہ پانچ روپے صرف کرکے آپ مشن کی امداد بھی کرینگے اور ایک ادبی مجموعہ کلام بھی ہاتھ آجائے گا۔ اب اسکا آفس بھی کتاب فروشی کے لئے بہتر اور مناسب مقام پر پہنچ گیا ہے۔ جواب کا منتظر رہوں گا۔ خدا حافظ۔

دُعا گو۔

آل رضا "

چھپن واں مکتوب

(۶۔ فروری ۱۹۷۲ء)

میں نے استاد مرحوم کو اپنے خط میں تحریر کیا تھا کہ امامیہ مشن صرف مذہبی کتب کی خرید و فروخت کرتا ہے اس ادارے میں غزلوں کا کوئی دیوان ہے نہ غزلوں کے فن پر کوئی کتاب ہے یہاں تو صرف سلام، مرثیہ اور منقبت کی کتابیں ہیں۔ میں نے یہ بھی اطلاع دی کہ اب رسالہ پیام عمل لاہور کے مدیر کوثر حسین صاحب نامزد ہوئے ہیں وہ ایک مقامی کالج میں پروفیسر ہیں اور عمدہ شاعر بھی ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ دہلی کے آغا شاعر قزلباش کے شاگرد ہیں ان کے دو دیوان شائع ہوچکے ہیں ان کی وجہ سے بہت ممکن ہے کہ رسالے کا معیار بلند ہوجائے اس خط کے آخر میں احقر کا لفظ بڑا معنی خیز ہے آج تک کسی استاد نے اپنے شاگرد کو خط میں احقر نہیں لکھا ہے۔

ڈیفنس سوسائٹی کراچی۔

۶۔ فروری ۱۹۷۲ء

عزیز گرامی قدر تسلیم و دعا۔ خدا کرے آپ مع متعلقین مع الخیر ہوں تلطف نامے کا شکریہ۔

سید کوثر حسین صاحب کا خط آیا تھا جس کی تعمیل میں نے کر دی ایک پرانا سلام بھیج دیا تھا جو پیام عمل میں شائع بھی ہو گیا۔ آپ کی تحریر سے ان کے اوصاف معلوم کر کے طمانیت محسوس ہوئی اس رسالے کے ادارے میں ان کی شمولیت بلکہ اس کی نگہداری رسالے کے لئے ضرور مفید ہو گی جناب حسن علی صاحب امامیہ مشن کے مینیجنگ ٹرسٹی کی جانب سے حال ہی میں ایک کارڈ موصول ہوا ہے جس میں مجھ سے میری قلمی اور مالی اعانت طلب کی گئی ہے اور پرانے پتے پر رسالے کے جانے اور بعض وقت واپس ہو جانے کی شکایت بھی درج ہے۔ یہ پرانا پتہ ۵۳۸/۱ گارڈن ایسٹ کا ہے جس کے متعلق میں آپ کو بہت دن ہوئے لکھ چکا ہوں غالباً ان صاحب کو ان اطلاعات کی کوئی خبر نہیں اور یہ بھی نہیں معلوم کہ میں کوثر حسین صاحب کو اپنے نئے پتے سے مطلع کر چکا ہوں۔

مالی اعانت بہ شکل خمس کے متعلق میری یہ حالت ہے کہ اب وکالت ترک کرنے کے بعد کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں رہا۔ سجاد رضا سلمہٗ کی دلھن مبلغ ۲۰ روپے ماہوار امامیہ مشن کے لئے نکالتی ہیں اب غالباً دو ماہ سے کوئی صاحب یہ رقم وصول کرنے نہیں آئے میں نے ایک شکل اعانت کی سوچی تھی جسے آپ نے مناسب نہیں سمجھا بہر حال ڈیڑھ دو سو کتابیں غزل معلّی کی اب بھی حاضر ہیں بشرطیکہ وہ ادارہ ان سے کچھ فائدہ حاصل کر لے۔

آجکل عرصے سے طبیعت بہت ناساز ہے۔ شعر و شاعری کا سلسلہ بھی ترک ہو چکا ہے۔ وہاں میرے سب ہمدرد حضرات کو بوقت ملاقات میرا سلام کہیے گا۔ خدا حافظ۔

احقر۔

آل رضا"

ستاون واں مکتوب

(۱۵۔اپریل ۱۹۷۲ء)

میں نے استاد مرحوم کو دو سلام اصلاح کے لئے ارسال کیے تھے اس میں دوسرے سلام کے قوافی توانائی بینائی اور گہرائی تھے۔ اس کے علاوہ رسالہ تنظیم الاسلام کے لئے کوئی نعت یا مذہبی نظم کی بھی فرمائش کی تھی۔ یہ خط انہی دونوں باتوں کے متعلق ہے۔ مطلع میں توانائی اور بینائی استعمال ہوئے ہیں۔ اسے مرحوم نے شائگاں کا عیب قرار دے کر اصلاح کردی اب مصرع اوّل میں گہرائی اور ثانی میں بینائی کردیا۔

" کراچی۔

۱۵۔ اپریل ۱۹۷۲ء

عزیز محترم سلامت رہیے

آپ نے دو سلام بھیجے ہیں۔ دیکھنے کا وقت کہاں ہے وہاں کی مجلسیں اب ختم ہونے کو آئی ہونگی اسی وقت جواب روانہ کررہا ہوں ایک سلام میں دو جگہ کچھ بنادیا ہے اور دو اشعار کے سامنے × نشان بنادیا ہے یعنی ان کا پڑھنا مجھے مناسب معلوم نہیں ہوتا بہرحال یہ صرف مشورہ ہے اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہاں کے ذی ہوش سامعین انھیں پسند کرینگے تو آپ کو پڑھنے کا اختیار ہے۔

دوسرے سلام کے دو اشعار کے علاوہ بقیہ سب شعر مجھے مناسب نہیں معلوم ہوتے مطلع میں ٓپ نے توانائی اور بینائی کہہ کر "نا" کو مقید کردیا ہے اور پھر اشعار میں اسکی پابندی نہیں کی۔ کسی اور طرح ٓ کوشش کیجئے خدا کرے آپ کی خواندگی مقبول ہو۔ آپ کی فرمائش کے مطابق تنظیم الاسلام کے لئے ٓ نظم لکھے دیتا ہوں جو یہاں ایک بار پڑھ چکا ہوں خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔ پرسان حال کو سلام

پُرخلوص۔

آل رضا "

اٹھاون واں مکتوب

(۶۔ نومبر ۱۹۷۲ء)

میں نے اپنے خط میں تحریر کیا تھا کہ اب مذہبی منافرت کے ساتھ صوبائیت اور مفاد پرستی کا مرض سارے ملک میں پھیل گیا ہے۔ اسی پر انتہا نہیں ہے بلکہ ہر صوبہ اپنی مادری زبان کا نعرہ لگا رہا ہے اس عمل سے علیحدگی پسندی کی بو آتی ہے۔ اردو اور اردو بولنے والوں سے امتیازی سلوک کیا جا رہا ہے اگر اس زہر کا تریاق تلاش نہ کیا گیا تو پورا ملک کینسر کے مرض میں مبتلا ہو جائے گا۔ جب اردو ہی نہیں تو اردو مرثیہ کس حساب میں گنا جائے گا۔

اس خط کے جواب میں مرحوم نے لکھا ہے کہ اردو بولنے والوں کا مستقبل نہایت تاریک ہے اللہ رحم کرے۔

ڈیفنس سوسائٹی کراچی۔

۶۔ نومبر ۱۹۷۲ء

عزیز گرامی قدر تسلیم و دعا۔ خدا کرے آپ مع متعلقین بخیر و عافیت ہوں تلطف نامہ مورخہ یکم نومبر ۷۲ء کا شکریہ۔ اس سے پہلے بھی ایک خط آیا تھا جس کا جواب لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ ضعیفی اور خرابی مزاج نے ایک عضو معطل بنا کر رکھ دیا ہے جس کا خود بھی افسوس ہے اور آپ سے بھی معافی کا خواستگار ہوں ماہ ستمبر میں آپ کا انتظار رہا۔

جن حالات کی خرابی کا آپ نے ذکر کیا ہے ان کی کیفیت سوہان روح ہے دعائے خیر کرتا ہوں مگر بد سے بدتر مستقبل نظر آتا ہے افسوس کیا سمجھا تھا اور اب کیا دیکھنے میں آ رہا ہے اب تو کھلم کھلا یہ بیان فرمایا جا رہا ہے کہ پاکستان کا دو قومی نظریہ سراسر غلط ہے اس مرحوم ملک میں پانچ قومیں اپنے اپنے صوبے کے لحاظ سے آباد تھیں جن میں سے ایک صوبہ کٹ کر علیحدہ ہو گیا اب چار باقی رقبے میں حتمی چار قومیں آباد ہیں۔ غرض کہ ہم لوگ جو باہر سے آ کر یہاں بس گئے ہیں وہ کہیں کے نہیں ہیں۔ البتہ اگر ہو سکے تو زبان اور ثقافت کے لحاظ سے کسی ایک قوم میں ضم ہو جائیں اور اسکے ساتھ یہ طفل تسلی بھی کہ اردو قومی زبان ہے اور رہے گی یعنی وہی پرانی بات کہ صحن سے لے کر چھت تک ہم اور چھت سے ثریا تک تم۔

اس سے زیادہ بس جاؤ ہوا کھاؤ خیر یہ بھی سہی ہم تو پاکستان کے بہی خواہ ہیں اگر بات یونہی بنتی ہو تو یوں ہی سہی ظہور حیدر صاحب کو نیز دیگر پرسان حال حضرات کو میری طرف سے تسلیم کہہ دیجئے گا۔ خدا حافظ۔

دعا گو۔

آل رضا "

انسٹھواں مکتوب

(۲۸۔ مارچ ۱۹۷۳ء)

یہ خط میرے اس خط کے جواب میں ہے جس میں میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ ہم لوگ آپ کا ایک مرثیہ شریکۃ الحسین لاہور سے شائع کرنا چاہتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ جناب زینب بنت علیؑ کے حال میں یہ مرثیہ سید آل رضا مرحوم کے شاہکار مرثیوں میں شمار ہوتا ہے۔ جناب نسیم امروہوی مرحوم نے مجھ سے کہا کہ آل رضا کا یہ مرثیہ مجھے بیحد پسند ہے۔ اسی خط میں میں نے ان چند حضرات کا بھی ذکر کیا جو آل رضا مرحوم کے کلام پر بیجا تنقید اور بلا دلیل نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں مرحوم نے اس خط میں ان کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اور دعا کی ہے کہ اللہ انھیں نیک ہدایت دے۔

" کراچی۔

۲۸۔ مارچ ۱۹۷۳ء

عزیز محترم تسلیم و دعا۔ محبت نامے کا شکریہ اس سے پہلے آپ کا صرف ایک خط آیا تھا جس کا جواب میرے ذمے تھا اس تحریر کے ذریعے سے آپ نے میرا ایک مرثیہ شائع کرنے کا قصد ظاہر کیا تھا میں چونکہ اس معاملے میں تساہل کرتا ہوں اسی وجہ سے جواب بھیجنا آج کل پر ٹلتا رہا۔

شاہد صاحب غالباً وہاں پہنچ گئے ہونگے مجھے امید ہے کہ ان کے مرثیے کا رنگ آپ لوگ

پسند کریں گے اور ایسی ہی مجالس کا چرچا لاہور میں اکثر رہے گا۔ مجھے تو وہاں بڑے پُر خلوص اور باہوش سامعین ملے تھے خدا کرے شاہد صاحب کی خواندگی کی سب مجالس بہت کامیاب ہوں۔

جس شخص کی آشفتہ مزاجی کا آپ نے بار بار ذکر کیا ہے ان کے متعلق میں کیا عرض کروں جس دماغی مرض میں وہ مبتلا ہیں وہ ان کے دم کے ساتھ ساتھ ہے۔ رشک' فتنہ و فساد' انانیت' خود مشتہری ان کے مزاج میں شامل ہیں اور وہ ان سے باز نہیں آسکتے۔ مجھے درحقیقت سخت افسوس ہوا کہ میں نے انھیں اتنے قریب سے کیوں جانا کہ تعجب سا تعجب ہوا۔ مجھ سے تو انھیں بغض بھی اس وجہ سے اور زیادہ ہے کہ انھوں نے یہاں میری ذات کو اپنی شہرت میں حائل سمجھ لیا۔ خیر ہوگا۔ اللہ انھیں نیک توفیق دے کہ اپنی غلط حرکتوں سے کنارہ کش ہو جائیں۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ آپ کا مرثیہ جب آئے گا اسے شوق سے پڑھوں گا۔

دُعا گو۔

آل رضا"

ساٹھواں مکتوب

(۱۰۔ اپریل ۱۹۷۳ء)

میں نے مارچ کے آخری دنوں میں دو سلام ارسال کیے تھے جب جواب نہ آیا تو کارڈ بھیجے اور درخواست کی کہ سلاموں پر اصلاح فرما کر جلد روانہ کر دیجئے یہ بات قارئین کرام کے پیشِ نظر رہے کہ سلاموں کے کہنے اور اصلاح کے لئے بھیجنے کی تاریخوں میں یکسانیت نہیں ہے میں نے متعدد سلام کہہ کر رکھ لئے تھے جنھیں بعد میں موقع بہ موقع اصلاح کے لئے روانہ کرتا تھا۔ پہلے سلام کا مطلع درج ذیل تھا۔

حُبِّ حسینؑ دیں کے ہر رضا بطلے میں ہے   جو بیر و حسینؑ نہیں جھگڑے میں ہے

استادِ محترم نے دوسرے مصرع میں درج ذیل تبدیلی کر دی۔

جو کربلا نواز نہیں بکدے میں ہے

دوسرے سلام کا مطلع درج ذیل تھا۔

سرور دل بشر کو توانائی دے گئے　　اندھی قباؤں کو وہ بینائی دے گئے

خط میں تحریر ہے کہ کسی اور طرح کوشش کیجئے مگر پنسل سے پہلے مصرع میں تبدیلی کردی۔

سرور نگاہ خلق کو گہرائی دے گئے

میں نے رسالہ ''تنظیم الاسلام'' کے لئے ایک نظم کی درخواست کی تھی جس کے جواب میں محترم نے وحی کے عنوان پر اپنی نظم بھیج دی لیکن یہ تاکید کی کہ درج ذیل قطعہ ضرور شائع کیا جائے۔

کسی کے دل میں کوئی بات ڈال دینے کو　　لغت کہے گی کہ ہے وحی ہو بری کہ بھلی
خدا کی بھیجی ہوئی وحی کے بھی ہیں درجے　　نگاہ اہل خبر میں جو ہیں صریح و جلی
نبی وہ وحی رضا میری نظم کا موضوع　　نبی کے پاس تھے تمام صحبتوں میں جیسے علی

'' کراچی۔

۱۰ اپریل ۱۹۷۳ء

عزیز محترم۔ سلامت رہیے

پوسٹ کارڈ موصول ہو چکا تھا آج لفافہ بھی پہنچ گیا۔ مجھے کل انشاء اللہ سالانہ مجلس ڈاکٹر یاور عباس صاحب کے یہاں پڑھنا ہے نیا مرثیہ کسی نہ کسی طرح تو کہہ لیا ہے مگر مطمئن نہیں ہوں اب میں اس قابل نہیں رہا۔ کہنے کو جانے دیجئے حسب دلخواہ پڑھنے کی بھی سکت نہیں رہی بہرحال اگر کل سہ پہر تک اس قابل رہا تو رسم ادا کر دوں گا۔ اللہ مالک ہے طبیعت کی خرابی بہت بڑھ گئی ہے۔

آپ نے دو سلام بھیجے ہیں۔ دیکھنے کا وقت کہاں ہے۔ وہاں کی دس مجالس اب ختم ہونے کو آئی ہوں گی۔ اسی وقت جواب روانہ کر رہا ہوں۔ ایک سلام میں دو جگہ کچھ بنا دیا ہے اور دو اشعار کے سامنے

کر اس کا نشان (×) بنا دیا ہے یعنی ان کا پڑھنا مجھے مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ بہر حال یہ صرف مشورہ ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ وہاں کے ذی ہوش سامعین انھیں پسند کر لینگے تو آپ کو پڑھنے کا اختیار ہے۔

دوسرے سلام کے دو اشعار کے علاوہ بقیہ تمام اشعار مجھے مناسب معلوم نہیں ہوتے۔ مطلع میں آپ نے توانائی اور بینائی کہہ کر "نا" کو مقید کر دیا ہے اور پھر اشعار میں اسکی پابندی نہیں کی کسی اور طرح سے کوشش کیجئے۔ خدا کرے آپ کی خوانندگی مقبول ہو آپ کی فرمائش کے مطابق تنظیم الاسلام کے لئے ایک نظم لکھے دیتا ہوں جو یہاں ایک دفعہ پڑھ چکا ہوں جس میں وحی کے موضوع پر مجھ سے طبع آزمائی کی فرمائش ہوئی تھی۔ خدا کرے آپ سب مع الخیر ہوں۔ یہ مختصر سی نظم ماہ ربیع الاول کے لحاظ سے مناسب ہوگی پرسان حال کو سلام پُر خلوص پہنچا دیجئے گا۔

خدا حافظ۔

آل رضا"

اکسٹھواں مکتوب

(۱۶۔ اپریل ۱۹۷۳ء)

۱۹۳۰ء کے آخری ماہ میں جوش ملیح آبادی کا مرثیہ "حسین اور انقلاب" لکھنؤ سے جون پور پہنچ گیا تھا۔ اگر چہ اس مرثیے کے معانی و مطالب سے میں بالکل بے خبر تھا پھر بھی نہ جانے کیوں اس کے مصرعے میری روح میں اتر گئے اور بند کے بند مجھے یاد ہو گئے۔ اسی زمانے میں استاد محترم بھی اپنا پہلا مرثیہ پڑھنے شہر کے ایک مشہور امام باڑے میں تشریف لائے امام باڑہ سامعین سے پُر تھا مرثیہ پڑھا گیا داد بھی دی گئی مجلس کے بعد میرے بھائی مولانا محبوب الحسن ان سے ملے۔ میں بھی وہاں موجود تھا لیکن اس مرثیے کا ایک مصرع بھی میرے پلے نہ پڑا میں بنارس جون پور الہ آباد فیض آباد اور لکھنؤ میں مرثیوں کی مجالس میں شرکت کرتا۔ لاہور میں استاد محترم کے دو مرثیے میں نے خود شائع کئے مگر جوش کا رنگ مرثیہ نگاری ذہن سے محو نہ ہو سکا۔ ۱۹۷۳ء

کے اوائل میں جب میں نے پہلا مرثیہ "ناموس وفا" کہا تو میرے ذہن پر جوش ہی کا رنگ غالب تھا۔ استاد محترم کے نزدیک یہ رنگ مرثیے کی بقا کے لئے سم قاتل تھا اسی لئے انھوں نے فنی غلطیاں تو درست کردیں مگر مرثیے میں کوئی خاص تبدیلی نہ کی۔ جب میں کراچی میں ان سے ملا تو انھوں نے عمودی اور افقی رنگ مرثیہ نگاری کا فرق سمجھایا۔ میں ان کی گفتگو سے متاثر تو ہوا اور دوسرے مرثیے "خون تبسم" میں عمودی طرز اپنانے کی لاکھ کوششیں کیں مگر ڈھاک کے تین پات کے مصداق مولوی مدن کی سی واڑھی نہ رکھ سکا۔ نتیجہ ظاہر ہے وہی ہوا جو پہلے مرثیے کا ہوا تھا۔ تیسرا اور چوتھا مرثیہ "شب عاشور اور خُلق حسن" بھی اسی انجام سے ہمکنار ہوا۔ جب پانچواں مرثیہ "حسین اور قربانی" ان کے زیر غور ہوا تو انھوں نے اسے درست بھی کیا اور بعض مصرے بھی تبدیل کئے۔ اب انھوں نے ڈاکٹر یاور عباس سے کہہ کر مجھے رضویہ امام باڑے میں پڑھوایا اور میری مجلس کامیاب کرانے کے لئے اکثر اہل علم اور شعرا کو فون کئے۔ اسی مجلس سے کراچی کے مرثیہ نگاروں نے مجھے بھی مرثیہ نگار سمجھا۔ استاد محترم نے جب اپنا بیسواں مرثیہ کہا اور پڑھا تو میں نے انھیں لاہور آنے کی دعوت دی۔ جس کا تذکرہ اس خط میں کیا گیا ہے۔

" ڈیفنس سوسائٹی کراچی۔

۱۶۔ اپریل ۱۹۷۳ء

عزیز گرامی قدر۔ سلامت رہئے

آپ کا ۹۔ اپریل کا رجسٹرڈ بھیجا ہوا مراسلہ مجھے کل ۱۰۔ اپریل کو دوپہر کے وقت ملا اور آج ۱۶۔ اپریل کو بعد دوپہر خط لکھ رہا ہوں تاکہ کل دن میں ۱۷۔ اپریل کو یہاں سے نکل جائے۔

مرثیہ اپنے رنگ میں ایسا ہے کہ میں نے بطور مشاورت کوئی مداخلت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ آپ کی اس رثائی تخلیق کا اپنا الگ رنگ ہے اور وہ آہنگ میری طرز مرثیہ گوئی سے بالکل مختلف ہے اپنے لحاظ سے اگر بدلنا چاہوں تو بہت کچھ بدلنا پڑے گا جو آپ کے لئے مناسب نہیں اور اگر آپ کی پسندیدگی کے لئے کہیں کہیں کچھ لفظی تغیر کردوں تو وہ میرے لئے مناسب نہیں۔

میری طبیعت عرصے سے مسلسل خراب ہے۔ شعر کہنے کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ بجھ بوجھ کر بھی جو کہو اس کے متعلق فوراً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے بہتر ہونا چاہیے مگر انتہائی کوشش کے بعد بھی یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بہتر صورت کیا ہو میری طرز مرثیہ گوئی کے متعلق جناب عابدی صاحب نے یہ سلسلۂ "عظمت انساں" جو ارقام فرمایا ہے وہ میرے دل کی بات کہی ہے اور جس کے متعلق مجھے یہ سخت حیرت ہے کہ ان کی دور رس نگاہ ایک ہی مرثیہ پڑھ کر میرے دل و دماغ کی تہوں تک کیوں کر پہنچی اور کتنی ٹھیک پہنچی۔ سو میاں الفاظ کو مرتب کر کے جس معنویت کے پھیلاؤ کو سمیٹنا چاہتا ہوں وہ اس ذی فہم کے لئے ایک تحفہ ہے جو اسے اپنی جگہ سمجھنا چاہے۔ ورنہ کچھ نہیں آپ نے جو میری تازہ ترین کوشش کے متعلق دریافت کیا ہے تو عرض ہے کہ اس بیسویں مرثیے میں بھی یہی دقت در پیش رہی مگر خدا کے فضل سے مولا کی مدد اتنی شامل حال رہی کہ جن باتوں کا لحاظ کر کے امامت اور حسینیت کی عظیم الشان کیفیتوں کو بیان کرنا چاہا وہ سعی اپنے خیال سے اتنی مشکور سمجھی کہ ایک بھری مجلس میں جہاں اہل ادب و شعور کا مجمع ہو پیش کر دوں۔ کہنے کو تو کہہ لیا لیکن ۳۰۔ مارچ آتے آتے طبیعت اتنی خراب اور مضمحل ہوتی چلی گئی کہ ڈاکٹر یاور عباس صاحب سے یہ کہنا پڑا کہ عین وقت کے لئے کوئی متبادل انتظام بھی تیار رہے۔ ادھر خود مرثیہ لکھ کر ہاشم رضا سلمۂ کو تیار کیا کہ اگر میں اس قابل نہ ہوں تو وہ یہ کلام مجلس میں پیش کر دیں حالانکہ بعض احباب کا یہ خیال تھا کہ رنگ گویائی کی طرح میری خوانندگی کا طریقہ بھی اپنی انفرادیت کا حامل ہوتا ہے اور اگر میں خود نہ پڑھ سکا تو خاصی کمی رہ جائے گی۔

غرض کہ جب وقت آیا تو بحمد اللہ میں خود ہی اس قابل تھا کہ جو کچھ عرض کیا ہے اسے حسب دلخواہ پیش کر دوں۔ سرکار حسینؑ نے اپنے اس ہیچ مداں خدمت گزار کو حسب معمول نوازا اور میں اس مہم سے باطمینان عہدہ برا ہو سکا۔ شاہد صاحب تو اس مجلس میں موجود تھے۔ تعجب ہے کہ انھوں نے آپ سے کچھ بیان نہ کیا نہ مرثیے کے متعلق اور نہ اپنے مرثیے کے متعلق ورنہ آپ کو مجھ سے دریافت کرنے کی ضرورت نہ کرنا پڑتی ہاشمی صاحب! میں در حقیقت کچھ نہیں ہوں مگر جو شرف سرکار محمدؐ و حسینؑ نے مجھ ایسے حقیر کو ہمیشہ سے مرحمت فرمایا ہے اس کا شکر ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

مجھے خود اس کا افسوس ہے کہ میں اب اس قابل کیوں نہیں رہا کہ لاہور حاضر ہو کر اپنے رضا نوازوں کو یہ مرثیہ سناؤں مگر اب میرا سن تقریباً ۸۷ سال کا ہے اور مریض ہو کر اس وقت بھی جتنا کہہ لیا مجھ ایسے شخص کے لئے موجب طمانیت خاطر ہونا چاہئے۔

شاہد صاحب کا نیا مرثیہ بھی خوب رہا۔ اب میں اس طولانی خط کو ختم کرتا ہوں آپ کو شاید یہ نہیں معلوم کہ مدیر افکار میرے والد مرحوم کے حقیقی چچازاد بھائی کے لڑکے ہیں میں اگر کہنا مناسب سمجھتا تو اس سے بہت پہلے ''افکار'' کا آل رضا نمبر نکل گیا ہوتا مگر میں اس معاملے میں مطلق بولنا ہی نہیں چاہتا۔ پوسٹ آفس نے اگر خط نہیں پہنچائے تو اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے میں نے کوئی تساہل نہیں کی اس کے علاوہ اور کوئی مرثیہ آپ کے پاس سے یہاں تک نہیں پہنچا وہاں میرے سب احباب کو بہت بہت تسلیم و آداب۔

خدا حافظ۔

آل رضا''

باسٹھواں مکتوب

(۱۴۔ مئی ۱۹۷۳ء)

یہ ''ناموس وفا'' کے عنوان سے میرا پہلا مرثیہ تھا جس میں چالیس بند تھے۔ میں نے اسے استاد محترم کی خدمت میں اصلاح کے لئے روانہ کیا اس کے حسن و قبح پر اس خط میں بحث ہے۔ اس مرثیے کے لفظوں اور مصرعوں پر بھرپور اصلاح کی گئی البتہ اسکی ساخت استاد محترم کو پسند نہ آئی کیونکہ میں جوش ملیح آبادی کے معروضی طریقۂ مرثیہ گوئی سے متاثر تھا۔ لفظی اصلاح کی مثال ملاحظہ کیجئے۔

میرا مصرع .... اللہ بولتا ہے وفا کی زبان سے۔

اصلاح .... تہذیب بولتی ہے وفا کی زبان سے۔

خط میں کئی مصرعوں کی تبدیلی کا ذکر آیا ہے۔ میں تمام اہل نظر اور اہل ادب سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ۲۲ سال تک اصلاح لینے کے باوجود کیا میں آل رضا مرحوم کے شاگرد ہونے کا حقدار نہیں ہوا۔

یہ واقعہ بھی اپنی جگہ پر بڑا پر اسرار ہے کہ کتاب "بیسویں صدی اور جدید مرثیہ" میں مصنف نے درجنوں مقامات پر میرا اچھا یا برا ذکر کیا ہے مگر افراد و اشخاص کی فہرست میں میرا نام غائب کر دیا گیا۔

ڈاکٹر ہلال نقوی کا پی ایچ ڈی کا یہ مقالہ ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا اس وقت ان کی عمر ۴۴ سال تھی اس عرصے میں وہ ایک بالغ نظر نقاد کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے ان کے شعور کے ہر گوشے میں یہ بات یقین کی حد تک آ چکی تھی کہ میں سید آل رضا مرحوم کا شاگرد تھا لیکن موصوف نے اپنی کتاب کے صفحہ ۷۵ پر یہ تحریر کر دیا کہ "وحید الحسن ہاشمی مرثیے میں قیصر بارھوی کے شاگرد ہیں" یہ جملہ تحریر کرنے سے قبل وہ مجھ سے استفسار کر لیتے یا قیصر بارھوی مرحوم سے پوچھ لیتے مگر انھوں نے ہم دونوں میں سے کسی سے دریافت نہ کیا بلکہ لاہور کے ایک شاعر کی دروغ پر مبنی ایک تحریر پر اعتبار کر لیا۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اسی لاہوری شاعر کے متعلق انھوں نے مجھے تحریر کیا۔

جناب ہاشمی صاحب۔ آداب

برادر محترم اسیر فیض آبادی کے نام آپ کا خط اور حوالہ پڑھا۔ مگر ہاشمی صاحب خدا کا غضب یہ تو دیکھیے کہ ظفر شارب صاحب نے خیانت کی حد کر دی انھوں نے عبدالروف عروج کا مرثیہ اپنے نام سے شائع کر دیا۔ میرے مقالے میں جو ۱۹۸۲ء کا ٹائپ شدہ ہے (جس کی ایک نقل کراچی یونیورسٹی کے کتب خانے میں اور ایک میرے پاس ہے) اس کے صفحہ ۲۲۱ پر یہ مرثیہ نقل ہے میں نے شارب صاحب کو ایک خط لکھا ہے۔ انھوں نے عروج مرحوم کی روح کو اذیت پہنچائی ہے اور کراچی کے ادبی حلقوں خصوصاً مرثیہ نگاروں میں ان کے خلاف بہت غصہ پایا جاتا ہے۔ یہ مرثیہ عروج مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس موجود ہے عروج کے اس مرثیے پر نسیم امروہوی مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیباچہ بھی موجود ہے۔ ہلال نقوی

۱۳۔ ستمبر ۱۹۹۰ء

جب ڈاکٹر صاحب کو ۱۹۹۰ء میں یہ علم ہو گیا تھا کہ لاہوری شاعر ایسا ہے تو ۱۹۹۳ء میں اسی کی تحریر کو حوالہ بنا کر شائع کرنے کی ضرورت کیا تھی اس تحریر میں مجھے ۱۹۷۵ء میں قیصر بارھوی کا شاگرد لکھنے کا واحد مقصد یہ تھا کہ آل رضا مرحوم کو مجھ سے بدظن کر دیا جائے اور وہ مجھے اصلاح دینا چھوڑ دیں مگر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ آل رضا مرحوم ۱۹۷۷ء تک مجھے اصلاح دیتے رہے اور ۱۹۷۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا نہ مرحوم ۱۹۷۹ء کی یہ تحریر اور نہ ۱۹۹۳ء کی ڈاکٹر ہلال صاحب کی کتاب دیکھ سکے۔

دوستی کے پردے میں جو بھی ہو ستم کر لو
لب پہ کر چکے بندش ہاتھ بھی قلم کر لو

(شعراب)

خط میں ایک طالب علم کا بھی ذکر ہے نہ اس کا نام صحیح ہے نہ ٹیلیفون نمبر۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے استاد محترم کو پریشان کرنے کے لئے یہ خط تحریر کیا ہے بھلا کسی امتحانی پرچے میں آل رضا کے متعلق کب سوال پوچھا جا سکتا ہے۔

" کراچی۔

دوشنبہ۔ ۱۴۔ مئی ۱۹۷۳ء

عزیز محترم۔ سلامت رہئے

تین چار دن ہوئے مرثیہ موصول ہوا چونکہ آپ کو جلد ہی پڑھنا ہے اس وجہ سے واپس کرنے میں تعجیل کر رہا ہوں طبیعت بہت خراب ہے اس خستہ اور خراب عالم میں بھی جو کچھ تھوڑی سی خدمت ہو سکی وہ حاضر ہے مگر میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ اگر بالمشافہ گفتگو ہوتی تو اپنا مفہوم جس طرح جی چاہتا پیش کر کے تبادلۂ خیال کے بعد کسی معقول مشورے کی کوئی صورت نمایاں ہوتی۔ کاش کہ یہ تبادلۂ خیال آپ نجم صاحب سے کرتے جو آج کل لاہور ہی میں ہیں۔ اب بھی اگر اس کا موقع ہو تو استفادہ مناسب ہوگا۔

میرا عالم اب یہ ہے کہ خود کوئی مرثیہ اپنی طبیعت کے موافق کہتے نہیں بنتا۔ جو کچھ کہنے کی

کوشش شروع کرتا ہوں اس کے متعلق فوراً یہ خیال شدت کے ساتھ دماغ پر مسلط ہو جاتا ہے کہ مجھے اب اس سے بہتر کہنا چاہئے مگر جب یہ غور کرتا ہوں کہ وہ بہتر صورت کیا ہو تو پھر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کو احساس کمتری کہئے یا احساس برتری۔ مگر کیا کروں اس کے نتیجے میں سخت محرومی سے دوچار ہو گیا ہوں۔ میرے یہاں ایک خاص کوشش ہوتی ہے یعنی نہایت پیوست قسم کا سلسلہ اور ربط اور اب وہی بات مجھے حاصل نہیں ہوتی۔ یہ چیز میں آپ کے کلام میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں جو مجھے اس مرثیے میں بہت کم ملی وہ بات مفصل طور پر صرف زبانی گفتگو ہی کے ذریعے سے پیش ہو سکتی تھی جس کا بحالت موجودہ کوئی امکان نہیں۔

آپ نے اپنی تحریر میں خود اس کمی کا ذکر کیا ہے اور مجھے اس سے اتفاق ہے۔ میں نے (ن) کے نشانات سے بعض متبادل صورتیں پیش کر دی ہیں۔ آپ کو اختیار ہے کہ جس صورت کو پسند کریں رکھ لیں۔ مثال کے طور پر مطلع کے بند ہی میں بیت کو لے لیجئے۔ آپ نے دیروز اور امروز کی جو ترکیب رکھی ہے مجھے خاصی اچھی معلوم ہوئی لیکن قبل کے چار مصرعوں میں جو صورت پیش کی گئی ہے اس سے سلسلہ و ربط والی بات پیدا نہیں ہوتی لہٰذا مجھے کچھ ترمیم کرنا بہتر معلوم ہوا پھر بھی جو صورت اختیار کی اس سے پورے طور پر مطمئن نہیں ہوا البتہ کچھ بہتر شکل نظر آ گئی۔

بند ۳۹ کے بعد بند ۴۰ کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا لہٰذا اگر مرثیہ یہیں پر ختم ہوتا ہے تو بند ۳۹ پر ہی ختم ہو جانا چاہئے یعنی تذکرۂ ثانی زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا پر۔ جناب اصغر کا ذکر اگر پہلے آ جاتا تو بہتر تھا یہ آپ نے خوب کہی ہے ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے جیسا کہ آپ نے پہلے مناسب سمجھا تھا یعنی یہ بند ۳۹ ہو جائے اور اس کے بعد بند ۴۰ جس پر آپ نے ۳۹ کا عدد لکھ دیا ہے لیکن تنگنگ کے خیال سے پھر اس بند کا دوسرا مصرع یوں ہو کہ "کیا کیا دکھائے جوہر گفتار قوم کو" اور پھر تیسرے مصرعے میں اک کی جگہ "یوں" کر دیا جائے۔

خدا کرے پنڈی میں آپ کی یہ مجلس ایسی کامیاب ہو کہ آپ بہت جلد اس سے بھی بہتر مرثیہ پیش کر سکیں۔ جو مسلسل اور مربوط بھی ہو میری پُر خلوص دعائیں قبول کیجئے۔

ایک خط ملفوف کر رہا ہوں جو مجھے پرسوں ملا ہے اس سے پہلے مجھے ان صاحبزادے کا کوئی مراسلہ موصول نہیں ہوا تھا آپ مندرجہ تحریر ٹیلیفون پر ان صاحب کو مطلع کر دیں کہ علیل ہوں پانچ سات دن میں اس فرمائش کی تعمیل کرنا اپنے لئے ممکن نہیں سمجھتا آپ کے پاس غزل معلّی ہے اور "شہادت سے پہلے اور شہادت کے بعد" والا مطبوعہ بھی جس میں عرض حال میں نے خود قلم بند کیا ہے یہ صاحبزادے اگر آپ کے یہاں جا کر ان کو پڑھ لیں تو میرے سب نجی حالات معلوم ہو جائینگے اور جو دو مرثیے آپ نے طبع کروائے ہیں یعنی عظمت انساں اور شریکۃ الحسین ان میں جو کچھ معتبر اور مشہور اہل قلم اور صاحبان شعور و ادب نے میرے متعلق تحریر کیا ہے وہ بھی یہ صاحب پڑھ لیں اگر ان چیزوں سے ان کا کام نکل جائے تو بہتر ہے چونکہ طالبعلم ہیں اور اپنے امتحان کے ایک پرچے کا ذکر کیا ہے اس وجہ سے میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ان کی کچھ مدد ہو جائے ورنہ میں عموماً ایسی فرمائشیں ٹال جاتا ہوں۔ غزل معلّی میں مری تصویر بھی ہے۔ جس کی وہ نقل کرالیں۔

دعا گو۔

آل رضا ''

تریسٹھواں مکتوب

(۱۷۔ مئی ۱۹۷۳ء)

میں نے اپنے خط میں لاہور میں شاہد نقوی صاحب کی کامیاب مجالس کا تذکرہ کیا۔ شاہد نقوی صاحب تقریباً پندرہ روز لاہور میں رہے اور انھوں نے مختلف مقامات پر مرثیے پڑھے اور داد و صول کی۔ میں نے ماہ رجب ۱۳۹۳ھ میں انھیں پھر لاہور آنے کے لئے مدعو کیا تاکہ لاہور کے شعرا میں بھی مرثیہ نگاری کا شوق پیدا ہو شاہد صاحب نے لاہور میں فقط مرثیے ہی نہیں پڑھے بلکہ مرثیہ نگاری کے سیمینار میں بھی شرکت کی اور مرثیے کی چند خصوصیات بتا کر یہ کہا کہ اگر اُردو شاعری کو زندہ رہنا ہے تو قدیم اور جدید مرثیوں کا سہارا لینا پڑے گا۔

کراچی۔

۱۷۔ مئی ۱۹۷۳ء

محبی سلامت رہیے۔ محبت نامے کا شکریہ۔ اس سے لاہور میں شاہد صاحب کی مجالس میں واشندگی کی بے حد کامیابی کا حال معلوم ہو کر بڑی طمانیت حاصل ہوئی۔ موصوف سے بھی اس موضوع پر خاصی گفتگو رہی کہتے تھے کہ گیارہ مجلسیں پڑھیں آپ حضرات کے حسن سماعت کے کمال معترف ہیں۔ میں ان سے پہلے کہہ چکا تھا کہ وہاں بڑے اچھے سامعین ملینگے۔ خدا کرے اس قسم کے مرثیوں کی قدر دانی لاہور میں خاطر خواہ ہو اور مقامی شعرا بھی اس بارگاہ میں مفید اور مقبول نذرانۂ عقیدت پیش کرتے رہیں۔ جن جن حضرات نے مجھے بھی اسی سلسلے میں یاد رکھا ان سب کو میری جانب سے پُرخلوص شکریے کا ناچیز تحفہ پہنچا دیجئے۔

۱۳۔ رجب المرجب کو شاہد صاحب وہاں پھر جانے کا ذکر کرتے رہے اور اپنے ساتھ میرا ذکر بھی۔ میں نے عرض کر دیا کہ میں اب اس قابل ہی نہیں رہا نیا کلام تو درکنار اپنا پرانا کلام بھی پیش کرنے کے لئے کہیں جانا اب میرے لئے ممکن نہیں رہا۔ صحت کی خرابی کا اب یہی عالم ہے۔ خدا انجام بخیر کرے۔ بڑا گنہگار ہوں آپ کا کہا ہوا مرثیہ ابھی تک یہاں نہیں پہنچا یہ اس لئے لکھ دیا کہ کہیں راستے میں گم نہ ہو گیا ہو۔ اب میں کسی کو مشورہ دینے کے قابل نہیں رہا۔ بہتر ہے یہ خدمت مجھ سے نہ طلب کی جائے۔ خدا کرے آپ مع الخیر ہوں وہاں کے دوسرے احباب کو سلام۔

دُعا گو۔

آل رضا"

چوسٹھواں مکتوب

(۳۔ جون ۱۹۷۳ء)

جب پہلا مرثیہ "ناموس وفا" اصلاح ہوکر آیا اور میں نے پڑھا تو ڈاکٹر صفدر حسین مرحوم نے مجھے گلے لگا کر شاباش دی دوسرے حضرات نے بھی میری اس پہلی کوشش کو سراہا۔ دوسرے دن علی الصبح ڈاکٹر عابدی صاحب میرے گھر آئے اور کہنے لگے کہ اس مجمع میں میں آپ کو داد نہ دے سکا اس لئے میں یہاں آکر آپ کو داد دے رہا ہوں مجھے اب یقین ہے کہ آپ لاہور میں مرثیہ گوئی کو زندہ کرینگے۔ بات بات میں انھوں نے تین اشعار کو تبدیل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں تو سکتے میں آگیا۔ اسی دن میں نے استاد محترم کو شکریے کا خط تحریر کیا اور وہ تینوں اشعار ان کی خدمت میں روانہ کردیے اسی خط میں انہی تینوں اشعار کا پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے۔ ہزار لوگ ہونہار لوگ اور یار لوگ والا بند میں نے مرثیے میں سے نکال دیا اور جب العطش جلد اول شائع ہوئی تو مزید چھ بند کہہ کر مرثیے کو ۱۳۵ بند پر ختم کردیا۔ خدا ڈاکٹر عابدی کی مغفرت کرے اتنا قابل ذہین اور موسمن شخص میری نظر سے آج تک نہیں گزرا۔ غالب اور انیس و دبیر کا ایک ایک مصرع ان کی نظر کے سامنے رہتا تھا۔

میں جناب ام البنین پر مرثیہ کہنا چاہتا تھا مگر مصدقہ حالات نہیں ملتے تھے استاد محترم سے بھی میں نے درخواست کی تھی کہ ان کی نظر میں شاید کوئی مرثیہ ہو تو تحریر کریں مگر انھوں نے کسی مرثیے کا ذکر نہ کیا نہ مرثیہ نگار کا نام لیا۔ چند برسوں کے بعد میں نے مختلف کتابوں سے حالات معلوم کئے اور مرثیہ کہا جس کا عنوان "آرزوئے علی" ہے۔

کراچی۔

۳۔ جون ۱۹۷۳ء

عزیز محترم سلامت رہیے۔ جس خط کا مجھے خود بڑا انتظار تھا اس کا جواب آج تین دن سے لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں مگر فرسودہ طبیعت اور مضمحل اعضا کا یہ رنگ ہے کہ قلم چلاتے نہیں بنتا۔ بہرحال آج لکھنے بیٹھ ہی گیا۔ آپ کے پہلے مرثیے کی خوانندگی کی ایسی قابل قدر مقبولیت میرے لئے بڑی طمانیت خاطر کا سامان لائی اب تو انشاءاللہ آپ اس طرف اور متوجہ ہونگے اللہ اور زیادہ کامیاب کرے۔

میں نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ میں آپ کے اس شکریے کا مستحق نہیں ہوں جو آپ نے ادا کیا ہے۔ یہ مرثیہ میں نے بہت جلدی میں دیکھا تھا اور بعض مقامات کے خلاف جہاں کچھ ترمیم زیادہ ضروری معلوم ہوئی بقیہ مرثیے کو اپنی اصلی حالت پر رہنے دیا۔ تاکہ آپ ہی کا رنگ واضح طور پر سامعین کے سامنے آئے لاہور کے سامعین کی وقعت میری نگاہ میں بہت زیادہ ہے۔ جو میرے ذاتی خوشگوار تجربے کا نتیجہ ہے۔ ایک مرتبے کا نہیں بلکہ بار بار کا تجربہ۔

اصل میں میں نے صرف چند بند پر اپنی توجہ صرف کی تھی لہٰذا خود میرے خیال سے ابھی وہاں بہت سی تبدیلیوں کی گنجائش ہے۔ ان کے علاوہ ایک چیز ہے جس کو مزاج مرثیہ کہتے ہیں وہ منزل تو بالمشافہ تبادلۂ خیال ہی سے طے ہوتی ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ آپ ماشاء اللہ خود ذی شعور ہیں اور شعر گوئی میں اپنا خاص رنگ بھی اختیار کرتے ہیں اس لحاظ سے آپ کے بقیہ مرثیے پر تبدیلیاں تجویز کرنا میرے لئے بڑا طول عمل تھا وقت بھی کم تھا بڑی فکر لاحق ہوئی کہ مرثیہ جلد سے جلد آپ کو واپس مل جائے تاکہ آپ خود مجوزہ ترمیمات پر غور کر کے آخری شکل اپنے مرثیے کو دے دیں۔ قبل اس کے کہ وہ مجلس میں پڑھا جائے آپ کا زیادہ الجھنوں میں گرفتار ہو جانا میں مناسب نہیں سمجھتا تھا البتہ ایک ہی کیطرف صرف ایک اشارہ کر دیا تھا کہ مرثیے میں ربط و تسلسل کا بہت لحاظ ہونا چاہئے اور پھر یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ بڑی اہم چیز ہے آپ نے اس کے جواب میں یہ لکھا تھا کہ شاعر خود ناقد نہیں بن سکتا ہے عموماً یہ صحیح ہے لیکن ہونا یہی چاہئے کہ انسان خود اپنے کلام کو بار بار اسی لحاظ سے مرکز توجہ بنائے کہ کہیں جھول نہ رہنے پائے۔ اپنی اپنی حد تک بڑے بڑے شاعروں نے یہی کیا ہے۔

اب میں ان تین اشعار کے متعلق اپنا خیال تحریر کئے دیتا ہوں جو آپ نے اس خط میں لکھے ہیں اور بعض الفاظ پر خط کھینچ دئے ہیں۔

(۱)۔ زخمی کوئی بچا ہی نہیں اس کے وار کا ....

اعتراض صحیح ہے۔ خط کشیدہ الفاظ جس رنگ تغزل کی طرف سامع کے خیال کو لیجاتے ہیں وہ سرکار ثانی زہراؑ کے مرتبے کے خلاف ہے مجھے تو یاد نہیں کہ آپ کا یہ بند کہاں تھا بہرحال میں نے اس پر اس

وقت غور ہی نہیں کیا تھا آپ اسے ضرور بدل دیں پہلا مصرع اگر یوں ہو جائے تو کیسا ہے۔" کیوں کر مقابلہ ہو بھلا اس کے وار کا" یا کوئی اور صورت جو خود آپ کو سمجھ میں آ جائے۔

۲)۔ زینب سے کائنات کو جنس حیا ملی ....

اعتراض صحیح ہے آپ اسے بھی بدل دیں۔ اس میں کوئی خاص بات بھی نہیں بلکہ جس غلو سے کام لیا گیا ہے وہ پہلے تو ایک صنف سمجھا جاتا تھا مگر اب میرے خیال میں اس سے احتراز بہتر ہے۔ معترضین نے غالباً جنس حیا کی ترکیب کو ابتذال یا ذم کی حامل سمجھا اگر لفظ کائنات کو نظر انداز کر دیا جائے تو کسی کا خیال بھٹک کر ادھر جا سکتا ہے۔ ورنہ نہیں۔ اگر آپ اس بند کو یونہی رکھنا چاہتے ہیں تو جنس کی جگہ شان کر دیجئے وہ ذم نکل جائے گا۔ اور پہلے مصرعے کو یوں کر دیجئے۔

"زینب سے ہمت بشری کو جلا ملی" یوں وہ غلو بھی نکل جائے گا اور حقیقت سامنے آ جائے گی۔ آپ کے اس بند کو میں نے اچھی طرح پڑھا بھی نہیں تھا۔

۳)۔ یار لوگ ....

اس بند پر میں نے توجہ کی تھی اور یار لوگ کو نکال دینا ضروری سمجھا کیوں کہ یہ الفاظ وقار مرثیہ کے خلاف ہیں قافیہ ردیف کی ترکیب تو مجھے بھی اچھی معلوم نہیں ہوئی مگر اس خیال سے کہ کم تعداد والے مرثیے میں ایک بند اور کم کر دینا غالباً مناسب نہ ہو اس بند کو کچھ ترمیم کے ساتھ اپنی حالت پر رہنے دیا۔ پ چاہیں کم کر دیں مگر اس میں کوئی اعتراض والی بات نہیں ہے آپ کا جو خیال تھا نظم ہو گیا۔ اور یار گ والا فقرہ نکل گیا۔

جناب ام البنینؑ کے حال میں میں نے بعض مرثیوں میں بہت سے بند سنے ہیں انتخاب زوجیت سے لے کر اس وقت کے حال تک جب یہ لٹا ہوا قافلہ مدینے واپس ہوا ہے اور ان معظمہؑ نے نہایت افسوس اور تعجب سے پوچھا ہے کہ ارے۔ یہ سب کچھ ہو گیا اور عباسؑ کہاں تھا۔ اور پھر جناب عباس علمدار علیہ السلام اور ان کے تین اور بھائیوں کے کارنامے بیان ہوئے جس پر ان چار شہیدوں کی ماں نے فخر کے ساتھ شکر خدا ادا کیا یہ فخر اس ماں کے علاوہ اور کسی ماں کو حاصل نہ ہوا کہ اس کے چار جواں

بیٹے صف شہدا میں شامل ہوئے اس معظمہ کا نام بھی فاطمہؑ تھا مگر انھوں نے اس گھر میں تعظیماً اس نام سے اپنے کو منسوب کرنا گوارا نہ کیا جب بیاہ کر آئیں تو یہ اعلان کیا کہ میں اس گھر کی بی بی کی اولاد کی خدمت گذاری کی حیثیت سے اس گھر میں آئی ہوں۔

یہ بہتر ہوگا کہ آپ مولانا مرتضیٰ حسین صاحب سے مفصل اور مصدق حالات دریافت کرلیں۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

خدا حافظ۔

آل رضا"

پینسٹھواں مکتوب

(۲۵۔ اگست ۱۹۷۳ء)

میں نے لفافہ یکم اگست بمطابق ۲۔ رجب کو بھیجا تھا جس میں حضرت علیؑ کے متعلق ایک منقبت تھی جسے مجھے ۱۳۔ رجب کو پڑھنا تھی مگر وہ اصلاح ہو کر ۲۹۔ اگست کو پہنچی مجبوراً وہی منقبت میں نے بغیر اصلاح پڑھ دی داد تو خوب ملی لیکن تنہائی میں ڈاکٹر عابدی نے کہا شاید یہ منقبت آپ نے اپنے استاد کی اصلاح کے بغیر پڑھ دی ہے میں ان کا مطلب تو سمجھ گیا کہ کوئی مصرع یا کوئی شعر غلط ضرور پڑھا گیا ہے مگر میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ منقبت کراچی ارسال کی تھی لیکن وقت مقررہ پر موصول نہیں ہوئی۔ جب اصلاح شدہ منقبت موصول ہوئی تو ایک شعر پر کراس (x) کا نشان لگا ہوا تھا اور اس کے نیچے یہ عبارت درج تھی کہ چھوٹی کی رعایت سے بڑی ناؤ ہونا چاہئے تھا میرا شعر یوں تھا۔

کعبے میں یوں تھے دست پیمبر پہ مرتضیٰؑ
چھوٹی سی ناؤ جیسے کوئی رکھ دے ناؤ پر

میں نے بعد میں یہ شعر نکال دیا کیونکہ میرے پاس بڑی ناؤ تھی ہی نہیں میں نے ۱۳۔ رجب کی محفل کے لئے استاد محترم کو دعوت شرکت بھی دی تھی مگر بیماری کی وجہ سے وہ نہ آسکے۔

نجم صاحب کے لئے میں نے تحریر کیا تھا کہ ان کی امداد کا کچھ ایسا سامان کر دیں کہ داماد پر وہ بوجھ نہ بنیں مگر معلوم ہوا کہ کراچی کی اتنی بڑی بستی میں کسی نے بھی ان کی امداد کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا اور وہ تنگ دستی میں اس دنیا سے چل بسے۔ جس شاعر نے ساری قوم کو جگایا جاگی ہوئی قوم نے اسے قبر کے اندھیرے میں سلادیا۔

بس معشوق مرا عشق کو بدنام کرتا ہے
خدا مجنوں کو بخشے مرگیا اب ہم کو مرنا ہے
(شاد عظیم آبادی)

" ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی۔
۲۵۔ اگست ۱۹۷۳ء

عزیز محترم۔ تسلیم و دعا۔ خدا کرے آپ مع متعلقین بخیر و عافیت ہوں۔ پوسٹ کارڈ مورخہ ۱۹۔ اگست موصول ہوا۔ اس سے پہلے جو لفافہ آیا تھا اس کا جواب بھیجنے کے خیال میں وہ تساہلی ہوتی رہی جواب میری ضعیفی اور طبیعت کی خرابی کا حلقہ ہو کر رہ گئی ہے اتفاق سے وہ خط میں کہیں احتیاط سے رکھ کر بھول گیا تھا کہ کہاں رکھا تھا کل سہ پہر کو بڑی تلاش کے بعد ملا۔

آپ کی تحریر کا ایک جز پھاڑ کر مع اپنے مشورے کے ملفوف کر رہا ہوں خدا کرے پہنچ جائے آج کل سیلاب کی قیامت خیز حالت کی وجہ سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مراسلت کا انتظام کب تک برقرار رکھا جا سکے گا۔ یہ معلوم کر کے طمانیت حاصل ہوئی کہ کوئی قدرداں صاحب آپ کے کہے ہوئے مرثیے کو طبع کرنے کی فکر میں ہیں۔ اخراجات تو ہر مد میں آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔

میں ۱۳۔ رجب کے سلسلے میں لاہور ضرور حاضر ہوتا مگر میاں اب میں اس قابل نہیں کہ سفر کر سکوں اور اپنی قیام گاہ کے علاوہ کہیں اور قیام کروں۔ کچھ دن ہوئے نجم صاحب ایک تقریب کے سلسلے میں ہوٹل انٹر پول میں ملے تھے ان کے داماد صاحب بھی ساتھ تھے ان کا قیام اپنے داماد کے ساتھ لانڈھی میں ہے مکان کا پتہ مجھے معلوم نہیں نجم صاحب اب بہت بہتر ہیں۔ آپ سب لوگوں کی محبت کا شکریہ

سب حضرات کو میری طرف سے بہت بہت تسلیم۔

دُعا گو۔

آل رضا

چھیاسٹھواں مکتوب

(۲۱۔ ستمبر ۱۹۷۳ء)

استاد محترم کا مرثیہ "شریکۃ الحسین" لاہور سے شائع ہو رہا تھا میں نے رجسٹری کے ذریعے اس کا پروف اس لئے ارسال کیا تا کہ اغلاط کی نشاندہی ہو جائے اسی مرثیے میں خزانہ کو خزانہ اور زمانہ کو زمانہ تحریر کیا گیا تھا چونکہ یہ مرکب لفظ نہ تھا اور قافیہ تھا اس لئے محترم نے اس پر اعتراض کیا بعد میں ان کے منشا کے مطابق تبدیلی کر دی گئی۔

میں نے ۱۴۔ شعبان کی محفل کے لئے دعوت دی تھی مگر گرم موسم کی وجہ سے انھوں نے لاہور آنا پسند نہ کیا اکتوبر ۷۳ء کے وسط میں شہادت حضرت علیؑ کے ایام تھے غالباً مرثیے کی رعایت سے انھوں نے یہ تاریخیں منتخب کیں چنانچہ وہ ۱۸۔ رمضان کو لاہور پہنچے اور انھوں نے تین مجالس پڑھیں۔ نواب عسکری صاحب مجھے خوب جانتے تھے اگر وہ آل رضا صاحب کی کوئی مجلس کرانا چاہتے تھے تو مجھ سے مشورہ کر کے کوئی پروگرام بنا سکتے تھے مگر انہوں نے لاہور میں رہتے ہوئے آل رضا صاحب کو نہ مدعو کیا نہ مجلس کا اعلان کیا۔ نیتوں کا جاننے والا تو خدا ہے مگر میرا خیال ہے "خدا کرے غلط ہو" کہ موصوف کے نزدیک سید آل رضا سے زیادہ سید مسعود رضا اور سید ہاشم رضا صاحب کی اہمیت تھی۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر احراز کا ایک واقعہ بھی سن لیجئے۔ عظمت انساں مرثیے پر انھوں نے اپنا مقالہ تحریر کیا اس میں مرثیہ نگاروں کی ترتیب یوں رکھی۔ (۱)۔ جوش ملیح آبادی۔ (۲)۔ ڈاکٹر صفدر حسین۔ (۳)۔ سید آل رضا۔

میں نے ان سے کہا ڈاکٹر صاحب آپ کی ترتیب تاریخ اور اخلاق دونوں حیثیتوں سے

مناسب نہیں سید آل رضا کو اگر آپ پہلا نمبر نہیں دیتے تو کم از کم دوسرا نمبر ہی دے دیجئے۔ انھوں نے برجستہ جواب دیا کہ میں اس ترتیب کو ہرگز نہ بدلونگا۔ مجھے اپنی اہلیہ کا پنڈی سے لاہور تبادلہ بھی کرانا ہے۔

محترم آل رضا صاحب اس ترتیب سے بڑے ناخوش ہوئے اور انھوں نے ڈاکٹر احراز کو جو شکریے کا خط تحریر کیا اس میں اس دانستہ ترتیب پر بڑے مہذب انداز میں گفتگو کی۔ میں نے استاد محترم کو اس راز سے آشنا نہیں کیا ورنہ وہ شکریے کا خط ہی نہ لکھتے۔ مگر اتنا ضرور لکھا کہ ڈاکٹر احراز نے مقالہ تو تحریر کیا مگر دودھ کی کڑاہی میں ایک مینگنی ڈال دی۔

" کراچی۔
۲۱۔ ستمبر ۱۹۷۳ء

مکرمی تسلیم۔ کل لفافہ پہنچا دیکھ کر فوراً جواب بھیج رہا ہوں کتابت اچھی نہیں ہے مگر یہ وبا تو عام ہے۔ بہرحال صاحب مطبع یا دیگر مہتمم حضرات اسکو بہتر سمجھتے ہیں میرے لئے دخل در معقولات مناسب نہیں۔ الفاظ میں غلطیاں زیادہ نہیں ہیں لیکن الفاظ یا فقرات کو علیحدہ دکھانے والی علامت (') صرف چند مقامات پر چھپی ہیں اور زیادہ تر ندارد ہے چونکہ آپ نے مجھ سے یہ خدمت لینا چاہی لہذا بادل ناخواستہ انجام تو دے دی مگر توقع نہیں ہے کہ مصلح سنگ یہ تمام زحمتیں گوارا کرلینگے۔ خیر بحالت موجودہ اگر اس مرثیے کو چھاپنے کی زیادہ فکر کی جائے تو بہتر ہے۔ اب تک جو ہوا وہی محنت میرے نزدیک رائگاں نہ ہوئی۔

ایک مرتبہ پھر عرض کردوں کہ آپ حضرات جس طرح چھپوانا پسند کریں میں اس میں مخل ہونا نہیں چاہتا۔ اب یہ آپ کی چیز ہے ایک بات اور قابل غور ہے اُردو میں ہائے مختفی قافیے کے لئے الف سے بدل دی جاتی ہے مگر اب کتابت میں اس کا خیال نہیں کیا جاتا اور غالباً یہ صحیح بھی ہے لہذا جس طرح بند نمبر ۲۵ میں زمانہ لکھا گیا تھا اسی طرح خزانہ بھی لکھنا چاہئے تھا اسی طرح بند نمبر ۵ میں تحفہ بھی لکھا جاتا۔

نواب عسکری صاحب نے مجھ سے بڑی لجاجت سے درخواست کی تھی مگر میں نے ان سے

صاف کہہ دیا تھا کہ اگر آپ مخصوص مجمع جو میری طرز مرثیہ گوئی کو پسند کرتا ہو اکٹھا کرسکیں تو میں حاضر ہوں اس کی ضرورت نہیں ہے کہ مجمع کثیر ہو جس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ یہی تو میں بھی عرض کرتا ہوں جیسا کہ میرا ارادہ ہے کہ مختصر مجمع مگر مخصوص سامعین اور میرا گھر۔ میں نے ان سے آپ کا نام لیا کہ اس قسم کے انتخاب میں آپ کا مشورہ مفید ہوگا۔

ہاشمی صاحب میں درحقیقت ان لوگوں کو سماعت کی زحمت دینا پسند نہیں کرتا جن کا مذاق مختلف ہو ان کا وقت بیکار کیوں ضائع کیا جائے۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ لاہور میں باوجود ادبی مرکز ہونے کے تحت اللفظ خوانی کی کوئی قابل ذکر قدر نہیں ہے لہٰذا میں عام طور سے وہاں اپنی مرثیہ گوئی کا نتیجہ پیش ہی نہیں کرنا چاہتا۔ مخصوص مستثنیات کی بات اور ہے خیر ان باتوں پر اس وقت غور ہوگا جب میں وہاں حاضر ہونگا۔ زندگی بخیر آخر ستمبر تک یہاں سے نکل جانے کا قصد ہے لیکن سجاد سلمہٗ کی رائے ہے کہ ابھی لاہور کا موسم گرم ہے میں فی الحال پنڈی چلا جاؤں جہاں ان کے بڑے بھائی حسن سلمہٗ میرا انتظار کر رہے ہیں۔ اور وسط اکتوبر تک لاہور پہنچوں اللہ مالک ہے امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ آپ کی عنایات کا بہت بہت شکریہ۔

منت کش۔

آل رضا''

سڑسٹھواں مکتوب

(۱۲۔ اگست ۱۹۷۳ء)

میں تقریباً ہر ماہ استاد محترم کو اس لئے خط لکھتا تھا کہ تنہائی اور بیماری کے عالم میں کوئی تو ان کا مونس و غمخوار ہو۔ فردوس کالونی میں تو اکثر حضرات ان کے گھر جا کر ان کا حال احوال پوچھ لیا کرتے تھے مگر ڈیفنس میں کون جا کر ان کی عیادت کرتا یا دو چار گھنٹے بیٹھ کر ان سے باتیں کرتا۔ خطوط سے کچھ تو دلجمعی ہو جاتی تھی اور کچھ ادھر ادھر کی خبریں مل جاتی تھیں۔

مجھ سے ڈاکٹر عابدی صاحب نے کہا تھا کہ ۳۱ء میں آغا شاعر نے لکھنؤ میں جناب عون ومحمدؑ کے حال کا ایک مرثیہ یہ کہہ کر پڑھا تھا کہ آج دہلی کا ایک مرثیہ گو لکھنؤ کی زبان میں مرثیہ پڑھ رہا ہے۔ میں نے استاد محترم سے اسی مجلس کے بارے میں استفسار کیا تھا لیکن انھوں نے یہ کہہ دیا کہ انھیں ایسی کسی مجلس کا حال معلوم نہیں۔ اس مرثیے میں درج ذیل مصرع بھی تھا جو لکھنوی رنگ کا ہے اور جس پر شاعر کو بے پناہ داد ملی تھی۔

بچوں کو کھیل کے لئے میدان مل گیا

" ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی۔

۱۲۔ اگست ۱۹۷۴ء

عزیز محترم دلی دعائیں۔ آپ کا خط مورخہ ۲۳۔ جولائی مجھے کل موصول ہوا۔ ۲۵۔ جون سے پھر مذکورہ بالا پتے پر سجاد رضا سلمہٗ کے یہاں مقیم ہوں کیونکہ احمد سلمہٗ اور ان کے عیال باہر گئے ہوئے تھے اور انھوں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ میں صحت کی موجودہ حالت میں وہاں تنہا قیام کروں۔ اس عرصے میں جو خط میرے نام وہاں آئیں ان کے متعلق یہ انتظام تھا کہ مجھے یہاں ملتے رہیں۔ خدا معلوم وہ خط کیا ہوئے جو آپ نے وہاں کے پتے سے بھیجے آپ کے اس خط کا جواب میں وہیں سے دے کر چلا تھا جس میں آپ نے اپنے لکھے ہوئے مرثیے کے دوبارہ پڑھنے کی مجلس کا ذکر کیا تھا جو ہونے والی تھی اس کے بعد اب یہ کارڈ موصول ہوا۔ جس کا جواب ارسال کر رہا ہوں۔ مجھے خود تعجب تھا کہ اتنے عرصے تک آپ کا کوئی خط کیوں نہیں آیا۔

مجھے اس مجلس کی کوئی اطلاع نہیں ہے جو آپ کی اطلاع کے مطابق آغا شاعر مرحوم نے ۳۱ء میں پڑھی تھی میں نے موصوف کا کوئی مرثیہ کبھی نہیں سنا البتہ ڈاکٹر یاور عباس صاحب دہلوی سے یہ معلوم ہوا تھا کہ آغا شاعر صاحب دلی میں باوقعت مرثیہ گو سمجھے جاتے تھے ان کے ایک صاحبزادے کراچی میں ہیں مگر مجھے اسکے سوا اور کچھ معلوم نہیں کہ وہ کتاب گھر نامی ایک کتاب کی دکان کہیں صدر میں چلا رہے

ہیں۔ آغا صاحب کی ایک صاحبزادی بھی ہیں جو شاعرہ بھی ہیں۔ مزید اطلاعات مہیا ہونے پر آپ کو مطلع کر دونگا۔ خدا کرے آپ مع الخیر ہوں مولانا مرتضیٰ صاحب کی مزاج پرسی کے لئے خط روانہ کر رہا ہوں۔ بیخ عشرے میں بشرط حیات پھر احمد سلمہٗ کے یہاں منتقل ہو جانے کا ارادہ ہے آپ کو میری طرف سے بہت بہت دعا۔

خدا حافظ۔

آل رضا "

اٹھاسیواں مکتوب

(۹۔ جنوری ۱۹۷۵ء)

آل رضا مرحوم کو جو لفافہ میں نے ارسال کیا تھا اس میں دو تازہ سلام برائے اصلاح تھے یہ سلام اصلاح کے بعد یکم فروری بمطابق ۱۹۔ محرم کو ملے میں نے اسی خط میں جناب شاہد صاحب کے متعلق یہ تحریر کیا تھا کہ ان کے سات مرثیوں کی کتاب نفس مطمئن اظہار سنز لاہور میں چھپنے کو دے دی گئی جس میں استاد مرحوم کا بھی ایک مقالہ بھی شامل ہے۔ شاہد نقوی صاحب سید آل رضا صاحب کے محبوب شاعر ہیں اور انھیں کے ایما سے اہل لاہور نے انھیں مجالس مرثیہ پڑھنے کے لئے مدعو کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ شاہد صاحب نے آل رضا صاحب کے رنگ مرثیہ گوئی کو اور آگے بڑھایا۔

محمد اسلم صاحب نہر کے محکمے میں چیف انجینئر اور اولوالالباب لاہور کے ایک اہم ممبر تھے وہ کہتے تھے کہ ہاشمی صاحب شاعر اولوالالباب ہیں میری کار ٹیکسی اولوالالباب ہے وہ شعرائے اہلبیت اور ذاکرین کو گھر سے لاتے اور اختتام مجلس ومحفل پر گھر پہنچا دیتے تھے اور اسے بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اسی ماہ میں اسلم صاحب کے والد کا انتقال ہو گیا۔ خط میں تعزیت نامے کا ذکر انہی مرحوم کے لئے ہے۔

کراچی کی ایک نجی ملاقات میں استاد مرحوم نے مجھ سے کہا کہ میں اب ایک مصرع کہنے کے قابل نہیں اصلاح دینا تو اور بھی مشکل ہے اس لئے آپ ڈاکٹر عابدی صاحب یا کسی اور سے مشورہ کر لیا کریں۔ میں نے ان کے اس بیان پر وہاں تو خاموشی اختیار کر لی۔ مگر لاہور آ کر انہیں اپنے خط میں تحریر کیا کہ آپ کے ہوتے کسی اور سے مشورہ لینا میری خودداری اور وفاداری کے خلاف ہے میں الٹا سیدھا خود کہہ کر پڑھ لونگا مگر آپ کے جیتے جی کسی اور سے اصلاح نہ لونگا۔

"ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی۔

۹۔جنوری ۱۹۷۵ء

عزیز محترم۔ کئی دن ہوئے رجسٹری شدہ لفافہ موصول ہوا تھا اسی دن سے جواب تحریر کرنے پر آمادہ ہوں مگر طبیعت کا یہ رنگ ہے کہ لکھنے کی نوبت نہیں آج کا ارادہ کل پر ٹل کر رہ جاتا ہے اور کوئی وجہ معقول نہیں موت کی قربت میں غالباً یہی کچھ ہوتا ہوگا۔ اکثر گفتگو میں اچھا خاصا معلوم ہوتا ہونگا۔ یہ تو گھر پر بیٹھ کر یا تھوڑی دیر کے لئے کہیں جا کر اس وقت صورت حال رہی ہے۔ جب تولید ریاح کی کثرت اور اس کی وجہ سے انواع واقسام کی تکلیفوں سے کسی حد تک نجات رہتی ہے ورنہ عام طور سے سکون طبع کو ترستا ہوں۔ لاہور میں مختلف مرثیوں کی متعدد بار خوانندگی نے مجھے بڑے خوش مذاق سامعین سے اچھی طرح متعارف کرایا۔ اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ پھر یہی لطف حاصل ہو۔ لیکن جہاں مجھے وہ نعمت حاصل ہو کر ایک عجیب خوشی حاصل ہوئی تھی وہاں اب اس سے محرومی کچھ عجیب طریقے سے حسرت ناک محسوس ہوتی ہے۔ سال گزشتہ تو میں نے طبیعت پر بہت جبر کر کے مرثیہ تیار کر لیا تھا مگر اب گھر میں بیٹھے رہنا اور انتہائی تمنا اور کوشش کے باوجود بجز مایوسی کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ سنتا تھا کہ ایک مرض ڈاکٹر صاحبان الرجی کہتے ہیں جس کے علاج اور جس کی علت ان کی سمجھ سے باہر ہے مجھے خود اپنی طبیعت کا یہی رنگ معلوم ہوتا ہے اپنے نزدیک بعض خوبیوں کا مجموعہ اپنے اشعار میں پیش کرنا چاہتا ہوں مگر وہ بات نصیب نہیں ہوتی جو کچھ کہتا ہوں جی چاہتا ہے کہ اس سے بہتر کہوں مگر پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بہتر صورت کیا ہو اسی طریقے پر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر کسی دوسرے کے کلام پر کوئی دماغ سوزی کروں تو کچھ ایسا ہی بے نتیجہ برآمد ہو۔ میں

نے چار دن ہوئے ڈاکٹر یاور عباس صاحب کی سمع ہمایوں تک پھر پہنچایا کہ وہ مجھے براہ کرم و رضا نوازی امسال سے نیا مرثیہ پیش کرنے سے معاف فرمادیں مگر انھوں نے اپنی محبت اور سعادت مندی کے باوجود نہایت سادگی اور صفائی سے کہہ دیا کہ "یہی تو اک بات ہے جو آپ کہیں اور میں نہ مانوں"۔ اب بتلایئے کہ کیا کروں۔ مرثیہ تو مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ وہ مرثیہ جو میں چاہتا ہوں۔

آپ کی تحریر سے یہ معلوم کرکے مجھے بڑی طمانیت خاطر حاصل ہوئی کہ آپ حضرات کے نہایت پسندیدہ شاعر کے سات مرثیے ۱! ہور سے شائع ہو رہے ہیں میں خود ان کے رنگ کلام کا دل سے معترف ہوں مگر حافظہ اس قدر مجروح بلکہ بے جان ہو چکا ہے کہ اب یاد کرنے سے بھی کچھ یاد نہیں آتا۔ اگر وہ اپنے کچھ مرثیے میرے پاس بھیج دیتے تو میں ان کا مطالعہ کرکے کچھ تفصیل کے ساتھ تحریر کرتا۔ یوں آپ خود اپنے مقالے یا مضمون میں بلا تامل یہ لکھ دیں کہ آل رضا نے شاہد صاحب کے مرثیوں کو کئی حیثیتوں سے سراہا ہے بلکہ لاہور کی مخصوص قدر دان ہستیوں کا غائبانہ تعارف موصوف سے کرایا۔ جس طرفداری کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ بہ وجوہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ خیر۔ اسلم صاحب کے نام تعزیت نامہ ارسال کر رہا ہوں۔ محترم عابدی صاحب کے نام عریضہ آپ ہی کے لفافے میں بھیج رہا ہوں۔ مجھے ان کے گھر کا پتہ یاد نہیں رہا۔ خداوند عالم انھیں جلد سے جلد صحت کاملہ عطا فرمائے اور بخیر و عافیت رکھے ان کی نوازشیں خوب یاد ہیں اور مرتے دم تک یاد رہینگی۔ اچھا بھئی! جو کچھ کہا ہے اسے عابدی صاحب کی ایسی ادب نواز ہستیوں کو بار بار سنانا چاہتا ہوں۔ یہ تحریر خاصی طویل ہوگئی زیادہ لکھا نہیں جاتا۔

ہاشمی صاحب۔ کچھ ایسا ہی مجبور ہوں کہ آپ کی محبت اور خلوص بھری بار بار طلبی کے باوجود وہاں کی حاضری سے اب قطعاً معذور ہو گیا ہوں۔ کئی شکائتیں ہیں جو سنبھالے نہیں سنبھلتیں۔ تفصیل طویل ہے۔ خدا انجام بخیر کرے۔ خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں مع عیال و اطفال۔ مولانا مرتضیٰ حسین صاحب سے ملاقات ہو تو بہت بہت سلام کہہ دیجئے گا۔ دوسرے تمام پُر خلوص احباب سے بھی۔ اچھا میاں خدا حافظ و ناصر دُعا گو۔

منت کش۔

آل رضا"

انہتروان مکتوب

(۲۷۔فروری ۱۹۷۵ء)

جناب شاہد نقوی صاحب کے مرثیوں کا پہلا مجموعہ نفس مطمئن کے نام سے میں اور راحت نقوی دونوں مل کر شائع کر رہے تھے اس کتاب پر مقدمہ تحریر کرنے کے لئے سید آل رضا مرحوم اور علامہ محمد مصطفیٰ جوہر مرحوم کو منتخب کیا گیا۔ میں نے آل رضا مرحوم کو اس سلسلے میں کئی خطوط روانہ کئے اس خط میں میرے ان خطوط کا جواب ہے آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ محترم سردار نقوی مرحوم سید مرحوم سے اشارے لیکر مضمون لکھیں گے اور پھر انھیں سنا کر دستخط کرالیںگے انہی دنوں میرے والد مرحوم شدید علیل ہو گئے۔ میں نے استاد مرحوم سے دُعا کی درخواست کی۔ پروفیسر مسیح الزماں کے انتقال کی خبر بھی میں نے ہی دی تھی۔

"۸/۱ سی گذری بلیووارڈ

ڈیفنس سوسائٹی کراچی

۲۷۔فروری ۱۹۷۵ء

عزیز گرامی قدر تسلیم و دُعا۔ محبت نامے کا شکریہ اس سے پہلے کا گرامی نامہ بھی موصول ہوا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ عدم تعمیل فرمائش کی شرمندگی نے اسی تساہلی کو بڑھا دیا جواب شدت کے ساتھ ہر کام میں محسوس ہوتی ہے۔ یہ ہے میاں استرخاء دماغی کا عارضہ۔ مگر اب میں اسکو کیا کروں کہ آپ کو نہ میری پست حالت کا اندازہ ہے اور نہ میرے بیان کو آپ باور کرتے ہیں آپ تو یہ جانتے ہیں کہ کچھ ہو میں شاہد صاحب کے مرثیوں کے متعلق ایک ہی سانس میں تنقیدی و توصیفی مضمون لکھ کر آپ کے پاس روانہ کروں۔ مداح میں بھی ان مرثیوں کا ہوں لیکن اپنی حالت سے مجبور ہوں جس کو آپ غالباً تصنع سمجھتے ہیں خدا جانے کیوں آپ یہ سمجھ لینے کو تیار نہیں کہ میں اب کوئی ایسا دماغی کام کرنے کے قابل ہی نہیں رہا

جو اس سلسلے میں انجام پا سکے۔ شاہد صاحب سے بھی اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ وہ حضرت بھی بہت مصر ہیں۔ میں نے یہاں تک کہدیا کہ بھائی میرا حال آپ کو اچھی طرح معلوم ہے۔ خود لکھ کر یا کسی اور سے لکھوا کر مجھ سے دستخط کروا لیجئے چنانچہ اس طرف وہی کوشش ہو رہی ہے آپ سمجھتے ہیں اس زمانے میں مرثیہ کہنے کی فکر میں منہمک ہونگا۔ جی ہاں مرثیہ شروع کیا سات بند کہے اور آگے غدار و لہٰذا ترک کر دیا خدا کرے آپ کے والد صاحب مدظلہٗ کی طبیعت اصلاح پذیر ہو میری جانب سے مزاج پرسی کر دیجئے گا۔ ۱۶۔ مارچ کو میرے پڑھنے کی مجلس ہے چار بجے سہ پہر کو لاہور میں بھی مجلس ہوگی بشرط حیات کوئی پرانا مرثیہ پڑھ دونگا۔ کیا کروں مجبور ہوں دعا ئیں۔

آل رضا"

ستروان مکتوب

(۳۔ مئی ۱۹۷۵ء)

میں نے اپنے خط میں اپنے پدر بزرگوار کے انتقال کی خبر دی تھی جن کا چند دنوں قبل انتقال ہو گیا تھا جناب شاہد نقوی صاحب کے مرثیوں کا مجموعہ نفس مطمئن لاہور میں اظہار سنز شائع کر رہے تھے یہ خبر بھی میرے خط میں شامل تھی خصوصیت سے میں نے جناب نجم آفندی کی خیریت دریافت کی تھی کیونکہ آل رضا مرحوم نجم آفندی مرحوم سے بہت متاثر تھے خود نجم آفندی مرحوم نے مجھ سے کہا کہ میں آل رضا اور رلجہ صاحب محمود آباد امیر محمد خاں کو بہت عزیز رکھتا ہوں جب میں نے پوچھا اور جوش ملیح آبادی کے بارے میں کیا خیال ہے تو کہنے لگے کہ حیدر آباد میں میں نے ان کی کئی غزلوں پر اصلاح دی لیکن اب تو وہ میرے بھی استاد ہو گئے ہیں۔

" ڈیفنس سوسائٹی کراچی

۳۔ مئی ۱۹۷۵ء

عزیز محترم دعائیں۔ تلطف نامے کا شکریہ خداوند رحیم و کریم آپ کے پدر گرامی قدر کو جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

خدا کرے شاہد صاحب کے مرثیوں کا زیر طبع مجموعہ ان کے سب ہی خواہ ادیبوں کے حسب دلخواہ ہو جو مضمون مجھ سے منسوب ہے وہ بہر حال بعض احباب کے اصرار کو پورا کرنے کے لئے کسی نہ کسی طرح مرتب ہو گیا آپ نے اتنا شدید اصرار نہ کیا ہوتا تو اس کی نوبت نہ آتی۔ نقد و تبصرہ کا شغل کبھی نہیں رہا سرسری گفتگو اور بات ہے۔ میرا کچھ عجیب عالم ہے ڈاکٹر یاور عباس کے یہاں مجلس کے سلسلے میں آخری مجلس مجھے بہر حال پڑھنا پڑی نیا مرثیہ شروع کیا مگر طبیعت صرف سات بند تک چلی۔ میں کیا کہنا چاہتا ہوں یہ بات اب میں کسی کا سمجھا نہیں سکتا۔ خیر۔ محض بات رکھنے کے لئے۔ ۶۸ء میں جو مرثیہ پیش کیا تھا (منبر پہ ہیں اعجاز خطابت کے نظارے) اسی کو کہیں کہیں پر کچھ الفاظ بدل کر پڑھ دیا تھا۔ مجلس میں جو رنگ ہوا وہ مولا کا عطیہ تھا۔ ہاشم رضا سلمہٗ کا پتہ یہ ہے۔ ہماری منزل ۱۳۔اے محمد علی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی۔

جناب نجم صاحب سے ملاقات شاذ و نادر ہو جاتی ہے اب بات کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ پرسان حال کی خدمت میں تسلیم۔

دُعا گو۔

آل رضا "

اکہتروان مکتوب

(۱۱۔اگست ۱۹۷۵ء)

لاہور میں راحت حسین نقوی صاحب کتاب "قرآن کیا کہتا ہے" مصنف و شاعر تھے وہ عام طور سے مذہبی اجتماعات میں سلام و منقبت سے محفل کو خوب گرماتے تھے جناب شاہد نقوی ان کے رشتے کے چچا ہیں وہ جب کراچی جانے لگے تو میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ استاد محترم سید آل رضا صاحب سے ضرور ملاقات کیجئے گا وہ کراچی گئے مگر ان سے نہ مل سکے۔ میں

نے استاد محترم کو بھی خط لکھ دیا تھا کہ راحت حسین صاحب آپ سے ملنے جا رہے ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ کراچی کے ایک بزرگ راحت حسین ناصری آل رضا صاحب سے ملنے گئے استاد محترم نے سمجھا شاید یہی راحت صاحب لاہور سے آئے ہیں گفتگو کے دوران راحت ناصری صاحب نے کہا کہ میں تو لاہور گیا ہی نہیں پھر بڑے غور و فکر کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ میرا خط لاہور کے راحت حسین نقوی کے بارے میں تھا اسی لئے اس خط میں نسیان کی شکایت کی ہے۔

"گذری بلیوارڈ
ڈیفنس سوسائٹی کراچی
۱۱۔اگست ۱۹۷۵ء

عزیز محترم دعائیں۔تلطف نامے کا شکریہ

بڑا افسوس ہوا کہ آپ کراچی آئے مگر مجھے مسرت ملاقات حاصل نہ ہوسکی یہ مقام ہے ہی شہر کے کنارے سمندری ساحل کے قریب۔

آپ کا خط ہاشم رضا سلمہٗ کو پہنچ گیا۔ میں نے یہیں راحت حسین صاحب سے ملاقات اور دریافت حال کی کوشش کی مگر موصوف نے اپنے مطلق لاعلمی کا اظہار کیا بعد کو بہت سوچنے کے بعد یہ خیال آیا کہ یہ راحت حسین صاحب غالباً وہ بزرگ ہیں جو وہاں کے مذہبی اجتماعات میں اکثر اپنے کلام ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ اب میرا حافظہ بہت ناقص ہو گیا ہے صحت کی بے انتہا خرابی میں نسیان کا بری طرح اثر ہے، خیر۔ اس چل چلاؤ میں اللہ انجام بخیر کرے حالانکہ میں اس کا مستحق نہیں ہوں۔

لاہور کے مذہبی اجتماعات اور وہاں کے احباب کا خلوص بہت یاد آتا ہے ان حضرات بوقت ملاقات میری جانب سے سلام نیاز عرض کر دیجئے۔ غالباً زیادہ دنوں تک احمد سلمہٗ اب اس کوٹھی قیام پذیر نہ رہیں گے۔ امید ہے کہ آپ مع متعلقین بخیر و عافیت ہوں گے۔ خوش بعافیت اور آباد رہئے۔

دُعا گو۔

آل رضا

بہتروان مکتوب

(۱۱۔اکتوبر ۱۹۷۵ء)

میں نے اپنے خط میں یہ تحریر کیا تھا کہ اپنے حالات زندگی لکھ کر ارسال کردیں تاکہ آنے والے وقت کے لئے سند ہو۔ مجھے خطرہ تھا کہ استاد محترم کے بعد نہ جانے لوگ کیا کیا تحریر کریں اور ان سے اپنی قربت کے فرضی افسانے شائع کریں۔ یہ میرا گمان ۷۸ء میں حقیقت کا لباس پہن کر سامنے آ گیا مرحوم کے چہلم کے موقع پر ڈاکٹر ہلال نقوی کا ایک کتابچہ تقسیم ہوا جس میں مرحوم کے شاگردوں میں میرا نام شامل نہیں کیا گیا حالانکہ میں ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۸ء تک ان سے اصلاح لیتا رہا۔ اسی سلسلے میں کراچی کے رسالے "سب رس" اپریل ۱۹۹۴ء میں میرا ایک مضمون سید آل رضا کی اصلاحیں بھی شائع ہوا تھا۔ مگر استاد محترم اپنی علالت کی وجہ سے اپنی زندگی کے حالات تحریر نہ کر سکے۔

سید امیر حسین رضوی لاہور کے علاقے گلبرگ میں مقیم تھے ان کا پٹرول پمپ فاطمہ جناح روڈ پر **Speed Works** کے نام سے مشہور تھا ایام محرم میں دس دن مجالس کرتے تھے جن میں روزانہ میں سلام پیش کرتا تھا لکھنؤ کے قریب شہر نگرام کے رہنے والے تھے بڑے تحمّل اور حوصلے کے انسان تھے افسوس کہ لاہور سے کراچی چلے گئے اور وہیں انتقال کر گئے۔

"گذری بولیوارڈ

ڈیفنس سوسائٹی کراچی

۱۱۔دسمبر ۱۹۷۵ء

عزیز محترم۔ تسلیم و دعا

مرثیہ پہنچا۔ سامنے میز پر رکھا ہے۔ طبیعت کا کیا رنگ ہے نہ پوچھئے خود کہتے نہیں بنتا دوسرے کو کیا مشورہ دوں بہر حال دل یہ چاہتا ہے کہ آپ کی فرمائش رد نہ ہو لیکن اب شعر و شاعری اپنے بس کی

بات نہیں رہی جو بھی کہتا ہوں پسند نہیں آتا سال گزشتہ سالانہ مجالس میں پرانے مرثیوں سے کام چلایا مگر بادل ناخواستہ یہ کمبخت احساس کمتری ہے کہ احساس برتری؟ بہر حال جو کچھ ہے افسوسناک ہے۔ شاید ''عظمت انساں'' کے بارفعت تبصروں نے دماغ خراب کر دیا ہے اس مرض کی تشخیص استرخا' دماغی ہے ضعیفی کا یہ حملہ میرے لئے سوہان روح ہے بہر حال ''شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن'' شعر و شاعری کے لحاظ سے میرے دو مطبوعات ''شہادت سے پہلے شہادت کے بعد'' اور غزل معلّی میں خود میرے لکھے ہوئے حالات زندگی سے آپ کا کام چل سکتا ہے۔

یہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ سید امیر حسین رضوی جو لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے تھے حال ہی میں راہی ملک عدم ہو گئے۔ مجھے بڑا صدمہ ہوا خدا مغفرت کرے بڑے اچھے اور شریف انسان تھے۔ میں بھی اب جانے والا ہوں۔ دعائے خیر فرمائیے۔ امید ہے کہ آپ مع متعلقین بخیر و عافیت ہو نگے پرسان حال کو بہت بہت تسلیم۔ لاہور کے قدر داں حضرات بہت یاد آتے ہیں۔

دعا گو۔

آل رضا''

تہتر واں مکتوب

(۱۶۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء)

یہ میرا تصنیف کردہ تیسرا مرثیہ ''شب عاشور'' تھا جسے میں نے استاد مکرم کی خدمت میں بغرض اصلاح ارسال کیا تھا۔ میں نے اس مرثیے میں شعوری کوشش کی تھی کہ شب عاشور کی رعایت سے انحراف نہ کروں مگر چونکہ بچپن ہی سے جوش کی شاعری اور ان کی طرز مرثیہ گوئی کا ذہن اسیر ہو چکا تھا اس لئے اس مرثیے میں پھر وہی رنگ جوش عود کر آیا۔ مجھے یہ علم نہ تھا کہ استاد محترم میرے اس نادانستہ طرز مرثیہ نگاری سے اتنے کبیدہ خاطر ہو نگے کہ مجھے شاہد صاحب یا جوش صاحب سے رجوع ہونے کی ہدایت فرمائینگے۔ جب میں نے چوتھا مرثیہ خلق حسن کہا تو

اصلاح کے لئے ان کے پاس نہیں بھیجا اور خود ہی اسکی نوک پلک درست کرتا رہا۔ اس عمل سے اول تو مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی دوم اتنا وقت مل گیا کہ استاد محترم میں جو تناؤ پیدا ہو گیا تھا وہ کم ہو گیا اسی کا اثر تھا کہ انھوں نے میرے پانچویں مرثیے "حسین اور قربانی" پر اصلاح بھی دی اور کراچی میں مجھے مرثیہ پڑھنے کے لئے دعوت بھی دی۔

حقیقت یہ ہے کہ استاد محترم ایک مستند وکیل تھے جس کا کام دلائل دے کر مقدمے کو جیتنا ہوتا ہے لیکن میں تعلیم کے شعبے سے منسلک تھا اور میرا کام تاریخی اسناد اور تجربات و مشاہدات کے ذریعے طالب علموں کے اذہان میں تلاش حق کا شعور پیدا کرنا تھا وہ امام حسینؑ کے وکیل بن کر یزیدی الزامات کی تردید کرتے تھے میں امام حسینؑ کا عقیدت مند بن کر کردار حسینی کے نمایاں پہلوؤں کو اسطرح اجاگر کرنا چاہتا تھا کہ افعال یزیدی کی خود بخود تردید ہو جائے انجام پر دونوں متحد تھے لیکن راستے میں تھوڑا سا فرق آ گیا تھا۔

اسکے علاوہ اُن کی اور میری عمروں میں تیس پینتیس سال کا فرق تھا میں کس طرح اتنی جلدی ان کے رنگ میں ڈوب کر مرثیہ کہہ سکتا تھا۔ میں نے ان کے تین قریب ترین شاگردوں جناب اختر وکیل، جناب وصی فیض آبادی اور جناب ظفر جونپوری کا کلام بغور دیکھا اور پڑھا ہے صرف دو چار بند آل رضا کی طرز کے ملے ورنہ بقیہ مرثیہ صرف مرثیہ ہے۔ بہر حال یہ استاد محترم کا فیض ہے کہ آج اچھے یا بُرے طور پر میرا بھی مرثیہ نگاروں میں نام آتا ہے۔

"ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

۱۶۔ دسمبر ۱۹۷۵ء

عزیز محترم تسلیم و دعا۔ عید الضحیٰ کی تعطیل کے بعد کل یہاں سرکاری دفاتر کھل رہے ہیں اس وقت تقریباً ۱۲ بجے شب کو یہ لفافہ بند کر رہا ہوں۔ تاکہ کل صبح کو احمد سلمہٗ اپنے دفتر جاتے ہوئے اسے لیجائیں اور وہاں سے کسی ڈاکخانے میں اسکی رجسٹری کرا دیں یہاں قریب کوئی ایسا ڈاک خانہ نہیں ہے گزشتہ چار دنوں میں رجسٹری نہیں ہو سکی تھی۔ آپ اس مرثیے کو دفتر رضا کار لاہور میں پہنچا دینا

چاہتے ہیں تاکہ کتابت ہو کر محرم نمبر میں شامل ہو جائے۔ اب میرے لئے مزید تاخیر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ تین چار روز تک تو آپ کا لفافہ کھول کر مرثیے پر وقت صرف کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ اب بہر حال آپ کی خاطر سے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑا۔ آپ کو بالتصریح اطلاع دے چکا ہوں کہ اس کام کے لئے میرا دماغ بُری طرح ماؤف ہو چکا ہے خود ہی کچھ کہتے بن نہیں پڑتا کسی دوسرے کو مشورہ کیا دوں۔ خیر ایک ذہنی شکنجے میں خود کو دو تین دن ڈال کر کچھ کوشش کی ہے جو بالکل نامکمل ہے خدا جانے کہ بنایا ہے یا بگاڑا ہے۔

اس مرتبہ پھر میں نے محسوس کیا کہ آپ جس طرز میں کہتے ہیں وہ میری طبیعت سے بعید ہے اکثر مقامات پر مجھے کچھ جناب جوش کا سا رنگ محسوس ہوا۔ میرا ایک رنگ تھا اچھا یا بُرا۔ سو اب وہ بھی نہ رہا۔ شعر و شاعری تو در کنار نثر نگاری بھی جو آتی تھی وہ تشریف لے جا چکی یہ سب کچھ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آپ کی دل شکنی نہ ہو جیسا کہ ایک مرتبہ ہو چکا ہے ماشاء اللہ شاہد صاحب کی طبیعت حاضر ہے آپ ان سے مشورہ کر کے دیکھیں اور مجھے معاف فرمادیں کہیں ایسا نہ ہو کہ میری جانب سے کچھ نامناسب ہمت شکنی ہو جائے آپ کے سامنے ماشاء اللہ ہونہار مستقبل ہے مشورہ بھی کسی ایسے ہی شاعر سے ہونا چاہئے۔ جناب جوش اگر اس طرف متوجہ ہو جائیں تو کیا کہنا ہے۔

بہر حال میں آپ کا پُر خلوص دعا گو ہوں اور جتنے دنوں مزید جینا ہے دلی خیر اندیش رہونگا۔ میری صحت بہت خراب ہو چکی ہر لمحہ آخری معلوم ہوتا ہے۔

خدا حافظ۔

آل رضا"

چوہتر واں مکتوب

(۳۰۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء)

مجھے نجم آفندی مرحوم کے وفات کی خبر ٹیلیفون سے ملی اور فون کرنے والے نے یہ بھی بتایا کہ

مرحوم کے جنازے میں صرف سات آٹھ حضرات شریک ہوئے میں نے فوراً استاذِ محترم کو خط لکھا کہ ساتھ سفر لاکھ کے کراچی شہر میں اتنے عظیم شاعر کے جنازے میں اتنی کم تعداد میں مومنین کی شرکت باعثِ حیرت ہی نہیں باعثِ ندامت بھی ہے۔ اس خط کے جواب میں انھوں نے اہلِ کراچی کی بے حسی پر افسوس کیا ہے۔

میں نے اپنا کہا ہوا تیسرا مرثیہ "شبِ عاشور" اصلاح کے لئے ارسال کیا تھا جس میں انھوں نے چند الفاظ کی تبدیلی کی اور تحریر کیا کہ مرثیہ بغور دیکھ نہیں سکا۔ اسی مرثیے کے متعلق مولانا ضمیر اختر نے اپنی کتاب "پاکستان میں اُردو مرثیہ" میں تحریر کیا ہے کہ اب تک کے تمام مرثیوں میں ہاشمی صاحب کا یہ سب سے اچھا مرثیہ ہے اس مرثیے میں بھی جوش ہی کا رنگ غالب ہے شاید اسی سبب سے استاذِ محترم نے اسے بغور نہیں دیکھا۔

ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی

۳۰۔ دسمبر ۱۹۷۵ء

عزیزِ محترم سلامت رہئے۔ محبت نامے کا شکریہ

آپ نے کچھ چلے جانے والوں کے نام گنوائے ہیں اب اس فہرست میں جو بہت بڑا اور مدتوں یاد کئے جانے والے نام کا اضافہ ہوا ہے وہ عزائے شاہِ شہیداں علیہم السلام کے سلسلے میں بہت یاد آئے گا۔ اور بہت دنوں تک۔ مجھے انتہائی افسوس ہے کہ کراچی میں جن حضرات کو یہ اطلاع ہوئی انھوں نے اس عظیم حسینی شاعر کی وفات کے متعلق کوئی خاطر خواہ تعزیتی اجتماع کا انتظام نہیں کیا۔ میں ایک مجلس میں ۲۵۔ دسمبر کو رضویہ امام بارگاہ میں گیا تھا جو مرحوم مسعود ادیب کے سلسلے میں ہوئی تھی اور وہاں پھاٹک میں اطلاعی بورڈ پر چاک سے یہ لکھا دیکھا کہ نجم آفندی آنجہانی ہو گئے وہیں بعد مجلس کچھ لوگوں کو بلا کر جو اس قسم کے اجتماعات کرتے رہتے ہیں سب کے سامنے پکار پکار کر کہا کہ اس میدان کا اتنا بڑا شاعر اٹھ جائے اور ہماری طرف سے اس شرمناک بے حسی کا مظاہرہ ہو۔ خیر اللہ مغفرت کرے یونہی میرے اٹھ جانے پر بھی یہی سلوک کیا جائے گا۔ افسوس صد افسوس۔ بہر حال اب مجھ سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ جلد

ی ایک بڑی مجلس ہوگی۔ دیکھئے۔

میاں مجھے بڑا افسوس ہے کہ میں آپ کے مرثیے پر خاطر خواہ مشورے تحریر نہ کر سکا۔ صرف یک مصرع ہوا کہ "کیا باشعور سجدے کی عظمت عطا ہوئی"۔

اب طبیعت کچھ ایسے ہی مصرعے چاہتی ہے مگر ہو نہیں سکتے۔

خدا حافظ۔

آل رضا"

پچھترواں مکتوب

(۵۔ فروری ۱۹۷۶ء)

میں نے دسمبر ۷۵ء میں تحریر کیا تھا کہ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ نجم آفندی جیسا بالغ نظر دنیا سے رخصت ہو جائے اور اس کے جنازے میں سات آٹھ آدمی شرکت کریں یہ خط بھی اسی کے جواب میں ہے جس میں استاد محترم نے کراچی کے حضرات کی بے توجہی اور اپنی بے بسی کا ذکر کیا ہے۔

یکم صفر ۱۳۹۶ھ استاد محترم نے ٹیلیوژن سے اپنا کہا ہوا ایک مرثیہ پڑھا اس مرثیے کی خوانندگی معیار کے مطابق نہ تھی میں نے استاد محترم کو اس غیر معیاری خوانندگی کی جانب اپنے خط میں توجہ دلائی تھی جس کا انھوں نے اس خط میں جواب دیا ہے۔

ٹیلی وژن ہی سے ایک مرثیہ نگار نے حضرت عباسؑ کا مرثیہ پڑھا جس میں حضرت عباسؑ کی جنگ کے نتیجے میں دشمنوں کی حالت دکھاتے ہوئے یہ مصرع کہا ہے۔

بد ذات سینہ پیٹ رہے تھے کھڑے ہوئے

لیکن اگر اس مصرع کو الگ کر کے پڑھا جائے تو یہ ماتمیوں پر زبردست طنز ہے استاد مرحوم نے مجھ سے اتفاق کیا کہ ایسا مصرع نہ کہنا چاہئے تھا۔

"ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

۵۔فروری ۱۹۷۶ء

عزیز محترم دعائیں۔نوازش نامے کا شکریہ

میں نے جو کچھ آپ کو اپنی اس کیفیت کا حال لکھا تھا جو حسینیات کے اس عظیم شاعر کے انتقال کی خبر سننے کے بعد ہوئی تھی اور میں نے رضویہ سوسائٹی کے امام باڑے میں بالاعلان بعض حضرات سے شکایتاً کہا تھا اسی کو شائع کر دیئے جس میں کسی مضمون نگاری کو دخل نہ تھا۔شاید میرا وہ عریضہ آپ کو نہیں ملا۔خیر میرے نزدیک نجم آفندی مرحوم کی بابرکت ذات بے مثل تھی اب کوئی ان کے لگ بھگ بھی نظر نہیں آتا۔ کراچی کے مومنین کی شرمناک کم توجہی میرے لئے موجب ندامت ہے میں تو اب کسی قابل نہیں رہا۔

میری جس خواندگی کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ زبردستی کی تھی میں نے ٹیلی وژن والوں سے بے انتہا معذرت کی تھی مگر وہ نہ مانے۔خیر۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ مرثیہ پڑھتے وقت میرا کیا عالم تھا۔یہ مصرع کہ۔

بد ذات سینہ پیٹ رہے تھے کھڑے ہوئے

ہے تو اسی قابل کہ اس کا مذاق اڑایا جائے حالانکہ ظاہر ہے کہ شاعر کا مقصد کچھ اور تھا بہتر ہوتا کہ اگر شاعر صاحب خود اس کا لحاظ کر لیتے۔خدا کرے آپ مع الخیر ہوں پرسان حال کی خدمت میں دست بستہ تسلیم۔

دعاگو۔

آل رضا"

چھتروان مکتوب

(۱۲۔فروری ۱۹۷۶ء)

کراچی ٹیلی وژن سے استاذ محترم کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا جسے سب سے زیادہ کامیاب

مشاعرہ کہا جاسکتا ہے اول تو کسی شاعر کی غزل معیاری نہ تھی دوم شعرا کی ترتیب بھی غلط تھی مشاعرہ شروع ہی سے ناکامی کا اظہار کر رہا تھا اسی ماحول میں جب استاد مرحوم نے اپنی غزل پیش کی تو اس لوگوں غریباں کا منظر آ رہا تھا۔ اسی منظر سے کبیدہ خاطر ہو کر میں نے انھیں خط تحریر کیا کہ آپ کے ساتھ مشاعرے میں یہ خنکی رویہ کیوں اختیار کیا گیا۔ اس کا جواب اس خط میں موجود ہے۔

میں نے محترم سے یہ بھی پوچھا تھا کہ مرثیے کے لئے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں جس کے جواب میں انھوں نے نہایت اختصار سے دو جملے تحریر کر دیئے ہیں۔ یہی دو جملے عقل مندوں کے لئے کافی ہیں۔

" ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

۱۲۔ فروری ۱۹۷۶ء

عزیز محترم دعائیں۔ تلطف نامے کا شکریہ

یہاں مشاعرے میں جو آج ہفتہ ذی الحجہ میں ہوا تھا میری شرکت مجبوراً ہوئی تھی مجھے اندیشہ تھا کہ یہ صحبت ادبی نقطۂ نظر سے ایسی ہی ہوگی جیسی کہ ہوئی۔ خیر۔ اب ڈاکٹر یاور عباس صاحب کے یہاں سالانہ مجلس مشتہر ہو چکی ہے جو ۔ مارچ کو منعقد ہوگی اگر زندگی اور صحت نے اجازت دی تو ان کے یہاں کے سلسلے کی یہ آخری مجلس پڑھنا ہی پڑے گی۔ بہت معذرت کی مگر گلو خلاصی نہیں ہو رہی ہے اسی دن دوپہر کو جوش صاحب ایرانیان ہال میں پڑھنے والے ہیں۔ افسوس ہے کہ نیا مرثیہ نہ کہہ سکوں گا۔ دو تین نئے بند کہہ کر پرانے مرثیے سے پہلے پڑھنے کا قصد ہے۔ مجبوری یہ راستہ اختیار کرائے گی۔ آپ اب تک یہ نہیں سمجھے کہ میری کیا حالت ہے میں درحقیقت معذور ہو چکا ہوں۔ تمام کوششیں بیکار ہیں۔ حسب دلخواہ کہتے نہیں بنتا۔ مصرع سے مصرع نکلے پھر مسلسل مضمون کی ترقی بیت میں ظاہر ہو اور مرثیہ اسی طرح اختتام کو پہنچے۔ اب یہ کہاں ممکن ہے حسب دلخواہ پڑھا بھی نہیں جاتا۔

خدا کرے آپ کی خواندگی کامیاب ہو امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

دُعا گو۔

آلِ رضا "

ستترواں مکتوب

(۱۰۔ جون ۱۹۷۶ء)

جناب شاہد نقوی پہلی مرتبہ بھی استاد محترم کے ایما سے لاہور آئے تھے اور یہاں انھوں نے اپنی مرثیہ گوئی کا خوب رنگ باندھا۔ اب انہیں دوسری مرتبہ مدعو کیا گیا اس مرتبہ بھی انھوں نے اہل لاہور کو کافی متاثر کیا میں نے شاہد صاحب کی کامیاب مرثیہ خوانی کی رپورٹ استاد محترم کو بھیجی تو انھوں نے یہ خط تحریر کیا۔ میں نے اپنے خط میں ان کی خیریت بھی دریافت کی تھی جس کا بڑا دردناک جواب موصول ہوا۔ محسوس ہوتا ہے کہ طاقت مرثیہ گوئی اور ہمت مرثیہ خوانی ٹوٹ جانے کے باعث وہ اپنی زندگی سے ناامید ہو گئے تھے۔

" ڈیفنس سوسائٹی کراچی

۱۰۔ جون ۱۹۷۶ء

محترمی تسلیم و دعا۔ محبت نامے کا شکریہ

شاہد صاحب کا وہاں پھر مرثیے پڑھنا اور آپ سب کی طمانیت خاطر کی اطلاع موجب طمانیت خاطر ہوئی۔ اپنے ایک عزیز کا یہ حال سنا کر بیچارے کو ایسا استسقا ہوا کہ خود پانی کا سامان مہیا ہونے کے باوجود پی نہ سکتے تھے بلکہ دوسرے شخص سے کہتے کہ میرے سامنے پیو اور میں تم کو پیتے دیکھوں یوں ہی غریب بالآخر پیاسے ہی مر گئے وائے نامرادی اللہ رے مایوسی۔ میں اب تک کچھ کچھ زندہ ہوں خاتمہ بخیر کی دعا فرمایئے وہاں پر پرسان حال کو میرا سلام کہئے۔ دست بدعا ہوں۔

معلوم نہیں میرے مکرم و محترم جناب پروفیسر عابدی صاحب اب کیسے ہیں۔ جب موقع ہو

میری جانب سے مزاج پرسی کر دیجیے گا صمیم قلب سے دست بدعا ہوں۔ امید کہ آپ مع متعلقین بخیر و عافیت ہو ں گے۔

خدا حافظ۔

آل رضا"

اٹھترواں مکتوب

(۳۰۔ ستمبر ۱۹۷۶ء)

ادارہ تنظیم الاسلام کی خواہش تھی کہ شاہد صاحب کا بھی ایک مرثیہ مختلف مقدمات کے ساتھ شائع کیا جائے لیکن اس مرثیے پر استاد مکرم کی بھی رائے یا تبصرہ حاصل کر لیا جائے چنانچہ میں نے وہ مرثیہ انھیں ارسال کیا لیکن وہ ڈاک کا رزق بن گیا اور ان تک پہنچ نہ سکا نہ مرثیہ شائع ہو سکا۔

میں نے استاد محترم سے بھی ایک نئے مرثیے کی فرمائش کی تھی تا کہ اسے "عظمت انساں" اور "شریکۃ الحسین" کی طرح شائع کیا جا سکے۔ مگر انھوں نے جواب دیا کہ انھوں نے تین سال سے کوئی مرثیہ ہی نہیں کہا۔

مولانا مرتضیٰ حسین کراچی پہنچے تو اپنے بڑے صاحبزادے مولانا حسین مرتضیٰ کے یہاں ٹھہرے ان کی خواہش تھی کہ آل رضا صاحب سے بھی ملاقات کر لیں چنانچہ مولانا حسین مرتضیٰ نے ہاشم رضا صاحب کو فون کر کے کہا کہ مرتضیٰ حسین آپ سے ملنا چاہتے ہیں ہاشم رضا صاحب کے ذہن میں نہ مولانا مرتضیٰ حسین کا خیال آیا نہ لاہور کی طرف دھیان گیا اسی سبب سے انھوں نے پوچھا کون مرتضیٰ حسین مولانا حسین مرتضیٰ اس جواب سے شدید رنجیدہ ہوئے اور انھوں نے مجھ سے شکایت کی کہ ہاشم رضا صاحب نے ہماری بڑی توہین کی۔ میں نے یہ واقعہ استاد محترم کو لکھ کر بتایا اسی کا جواب اس خط میں موجود ہے۔ مولانا مرتضیٰ حسین نے مجھ سے اس سلسلے میں کوئی گفتگو نہیں کی۔

"ڈیفنس سوسائٹی کراچی

۳۰۔ ستمبر ۱۹۷۶ء

عزیز محترم محبت نامے کا شکریہ

شاہد صاحب کا مرثیہ مجھ تک نہیں پہنچا نہ معلوم کس پتے پر بھیجا گیا ہے اگر وہ مرثیہ کراچی میں پڑھ چکے ہیں تو میں اسے سن چکا ہونگا۔ موصوف مرثیہ خوب فرماتے ہیں اللہ انھیں اس سے زیادہ مرثیہ گوئی کا سلیقہ مرحمت فرمائے۔ آپ نے میرا نیا مرثیہ لاہور سے اشاعت کیلئے طلب فرمایا ہے معلوم نہیں آپ کس مرثیے کو نیا مرثیہ کہتے ہیں تین سال سے میں نے کوئی نیا مرثیہ نہیں کہا ہے افسوس ہے کہ مجھ سے یہ نعمت چھن گئی بہت گنہگار ہوں یہ سزا تو کچھ بھی نہیں ہے بیس مرثیے کہہ کر مجھے یہ سلیقہ نہیں رہا کہ نیا مرثیہ کہوں۔ سالانہ مجالس میں باوجود معذرت کے اگر بانیان مجلس معاف نہیں کرتے تو کوئی پرانا مرثیہ کسی نہ کسی طرح پڑھ دیتا ہوں اب تو پڑھا بھی نہیں جاتا بہرحال آپ جو مرثیہ چاہیں وہاں سے شائع کر سکتے ہیں مگر اب مرثیہ وہاں بھیجنے کے لئے نقل کون کرے میری یہ زندگی ہی ختم ہوگئی۔ اگر مولانا مرتضیٰ حسین صاحب سے ملاقات ہو تو میری جانب سے اظہار تاسف کر دیجئے گا۔ مولانا مرتضیٰ حسین صاحب کی ہاشم سلمہٗ سے خفگی میرے لئے بڑی تکلیف دہ ہے ہاشم سلمہٗ نے مجھے کتنی مسرت سے اطلاع دی تھی کہ مولانا دوسرے دن ٹیلیفون کرکے مجھ تک ہاشم سلمہٗ سے پتہ پوچھ کر تشریف لائینگے۔ اس کے بعد کم سے کم مجھے تو اس کا وہم وگمان بھی نہیں ہو سکتا کہ جب ان کے صاحبزادے نے ٹیلیفون کیا تو انھوں نے کوئی بدتمیزی کی۔ کون مرتضیٰ حسین سے کیا ظاہر نہیں ہوتا کہ درحقیقت یہ جاننا مقصود تھا کہ کون صاحب ان کے پاس آنا چاہتے ہیں۔ ہاشم سلمہٗ کے پاس مختلف قسم کے ملنے والے آیا کرتے ہیں۔ بہرحال مجھے بڑا افسوس ہے کہ ٹیلیفون کی وجہ سے یہ صورت رونما ہوئی میں آپ کو اس سلسلے میں مفصل خط لکھ چکا ہوں معلوم ہوتا ہے کہ پہنچا نہیں خدا کرے آپ سب مع الخیر ہوں۔

دعا گو۔

آل رضا"

اناسی واں مکتوب

(۱۷۔ نومبر ۱۹۷۶ء)

مہدی حسین عزم جونپوری ایڈووکیٹ مفتی محلے میں رہتے تھے اور مجلس و محفل میں بڑی پابندی سے شرکت کرتے تھے وہ جناب ذوالفقار حسنین صاحب جونپوری شاگرد مرزا دبیر کے شاگرد تھے میں نے ذوالفقار صاحب کو اپنے بچپن میں دیکھا اور سنا تھا۔ جناب مرزا طاہر رفیع نبیرۂ دبیر دو مرتبہ جونپور تشریف لائے تو ان کا قیام اور ان کی مجالس ذوالفقار حسنین صاحب ہی کے امام باڑے میں ہوئیں۔ مرزا طاہر نے ایک مجلس میں کہا میر انیس میر نفیس اور میرے باپ مرزا اوج اور دادا مرزا دبیر نے گھوڑے کی چال کے بارے میں بہت کچھ کہا مگر کسی نے گھوڑے کے ساتھ لہلہا کے چلنا نہیں باندھا یہ شرف مولا نے مجھے بخشا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

پری نہیں تھا وہ سبزہ تھا لہلہا کے چلا

مجمع تو اچھل پڑا مگر میں کچھ نہ سمجھا بعد میں والد صاحب نے بتایا کہ گھوڑے کی ایک قسم سبزہ ہوتی ہے جس کی رعایت سے لہلہانا استعمال ہوا ہے۔

محسن جونپوری ذوالقدر بہادر کے بیٹے تھے اور شاعری میں محسن ہی تخلص کرتے تھے سال بھر میں صرف ایک مرثیہ کہتے تھے اور ۱۸ صفر کو پڑھتے تھے محسن صاحب میرے ہم سن تھے مگر جونپور میں ۱۹۴۷ء تک میں نے انھیں مرثیہ پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔ جب وہ لاہور آئے تو ان سے میری ملاقات ہوئی۔ گلبرگ لاہور میں انھوں نے حضرت عباس کا مرثیہ پڑھا جس کا یہ مصرع کئی حضرات کے مرثیوں میں دیکھ چکا ہوں۔

ایسے علم کو ایسا علمدار چاہیے

کراچی میں محسن مرحوم کے صاحبزادے احسن میاں اپنے والد ہی کی طرح مرثیے پڑھتے ہیں مگر خود شاعر نہیں ہیں۔

ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

۱۷۔نومبر ۱۹۷۶ء

عزیز محترم سلامت رہئے خدا کرے آپ مع متعلقین واحباب مع الخیر ہوں۔

عرصے کے بعد آپ کا محبت نامہ پرسوں ملا۔ خدا وہاں آپ سب کو ہمیشہ بعافیت اور باطمینان رکھے۔ جی ہاں عزم صاحب مرحوم ہو گئے۔ مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ مجھے سپرد خاک کریں گے مگر ان معاملات میں اپنا کوئی اختیار نہیں ہے۔

محسن صاحب کا تعلق جونپور کے شہر اور مرثیہ گو خاندان سے ہے دو مجلسوں میں مجھے بھی سننے کا اتفاق ہوا۔ مجلس میں بڑی داد وتحسین کی افراط سے سابقہ ہوا۔ کچھ باتیں مجھے بھی اچھی معلوم ہوئیں اور کچھ باتیں بس کچھ نہ پوچھئے۔ بہر حال وہ مجھ سے بہتر ہیں مگر کیا عرض کروں۔ زیادہ تر رنگ تو پرانے ہونے میں کلام نہیں ہے۔ مگر ایک ایسی بات مشاہدے میں آئی کہ ایک جونپوری سے پوچھنا پڑا کہ یہ کہاں کی پیداوار ہے وہ ہے بعض اشعار کو خاموش رہ کر اشاروں سے پڑھنا اور اپنے نزدیک سامعین کو اشاروں سے اس طرح محظوظ کرنا کہ بغیر الفاظ سنے ہوئے شعر کا لطف اشارے سے آجائے۔ میرے سننے میں کہیں اس قسم کی پڑھائی نہیں آئی تھی۔ صفدر صاحب نے بھی پڑھنے کی یہ ترکیب نہیں دکھلائی۔ خیر میں معترض نہیں ہوں نئی بات ضرور تھی اس قدر فن کاری لکھنؤ میں بڑے بڑے مشاق اور مشہور پڑھنے والوں میں کسی کو یہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

شاہد صاحب نے خود مجھے وہ مرثیہ دیا جو پرسوں آپ کے خط کے ساتھ ڈاک کے ذریعے سے مجھے موصول ہوا۔ شکریہ۔ میں عنقریب یہ مکان چھوڑنے والا ہوں بعد کو پتے سے مطلع کروں گا۔ بشرطیکہ زندہ رہا۔ اب نہ پڑھا جاتا ہے اور نہ کہا جاتا ہے ہاشم سلمۂ ابھی یو۔ ایس۔ اے سے واپس نہیں ہوئے۔

دعا گو۔

آل رضا

اسی واں مکتوب

(۳۱۔ مارچ ۱۹۷۷ء)

کراچی میں ہڑتالوں کی وجہ سے ڈاکیوں کی قسمت جاگ اٹھی اول تو وہ ڈاکخانے ہی نہیں جاتے دوم ڈاکخانے سے خطوط لاتے ہیں تو نالے ندی میں بہادیتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ لاہور کے خطوط نہ کراچی والوں کو ملتے ہیں نہ کراچی کے خطوط اہل لاہور تک پہنچتے ہیں۔ اسی نقص کے بارے میں اس خط میں ذکر موجود ہے۔

میں نے اپنے خط میں تحریر کیا تھا کہ آجکل مومنین شدید تعصب کا شکار ہیں اور اگر پیپلز پارٹی ختم ہوگئی اور مولوی صاحبان برسر اقتدار آ گئے تو ہمارے لئے جینا دوبھر ہوجائے گا۔ اس سلسلے میں استاد محترم نے مفتی محمود کی پارٹی کو مورد الزام ٹھہرایا ہے۔

میرے استفسار پر کہ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے انھوں نے اپنے خط میں بتایا کہ آج کل عجب عالم ہے نہ مرثیہ کہہ سکتا ہوں نہ پڑھ سکتا ہوں۔

" بنگلہ افسران نیوی نیا پل کراچی

۳۱۔ مارچ ۱۹۷۷ء

عزیز محترم دعائیں

خدا آپ سب کو محفوظ اور باطمینان رکھے۔ آج کل آئے دن ہڑتال کی وجہ سے خط بھیجے میں ڈالے جانے کے باوجود بھی یہ تیقن نہیں ہوتا کہ کوئی قاعدے سے نکال کر وہاں پہنچانے کے راستے پر ڈال دے گا۔

مفتی محمود جس پارٹی کے سربراہ ہیں اس میں بہت سے لوگ ہم بے گناہوں سے محض تعصب کی بنا پر خار کھاتے ہیں ہم جو ہیں وہ ہیں اور انشاءاللہ وہی رہینگے۔ لیکن حاشا وکلا متعصب نہیں ہیں۔

مرثیہ نہ اب میں کہہ سکتا ہوں نہ خاطر خواہ پڑھ سکتا ہوں۔ پروفیسر عابدی صاحب اور مولا مرتضیٰ صاحب نے ان صاحب کی بڑی تعریف اور توصیف کی جو مجھ سے خواہ مخواہ خار کھاتے ہیں

حال میں کسی کا بدخواہ نہیں ہوں۔ خدا ان سب حضرات کو اچھا رکھے۔

میری صحت بہت خراب ہو چکی ہے آج کل عجیب عالم ہے میری بیوی اپنی چھوٹی بیٹی کے پاس اسلام آباد گئیں اور گر پڑنے سے دوسری ٹانگ بھی ٹوٹ گئی۔ بہر حال خدا کا شکر ہے خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

دعا گو۔

آل رضا "

اکیاسی واں مکتوب

(۴۔دسمبر ۱۹۷۷ء)

اس سے قبل میں تحریر کر چکا ہوں کہ میں نے اپنا چوتھا مرثیہ "خلق حسن" استاد محترم کے پاس اس لئے نہیں بھیجا کہ وہ مجھ میں اپنا رنگ مرثیہ گوئی دیکھنا چاہتے تھے اور میں ان کے معیار پر پورا نہیں اتر رہا تھا۔ اسی وجہ سے وہ کچھ تناؤ کا شکار بھی ہو گئے تھے۔

اب میں نے بڑی محنت سے یہ پانچواں مرثیہ "حسین اور قربانی" کہا اور یکم دسمبر کو اصلاح کے لئے کراچی بھیج دیا۔ اس خط میں اسی کا ذکر ہے۔ میں نے قیصر بارھوی کے گیارہ مرثیے "عظیم مرثیے" کے نام سے شائع کر دئے۔ اس خبر کی اطلاع بھی میرے خط میں تھی۔

۱۹۴۔بی مسکن نیول آفیسرز کراچی

۴۔دسمبر ۱۹۷۷ء

عزیز محترم۔ پوسٹ کارڈ پہنچا بہت بہت شکریہ۔ "مرثیہ حسین اور قربانی" ابھی تک نہیں پہنچا امید ہے کہ یہ مرثیہ نجی طور پر پڑھنے میں مجھے خاصی دلچسپی ہوگی۔

میں اب خود مرثیہ کہنے یا خود اپنا کہا ہوا مرثیہ پڑھنے کے قابل نہیں رہا۔ بہر حال ے۔ محرم کو انشاء

اللہ بشرط حیات وصحت مرثیہ پڑھنا ہے ممکن ہے کہ پرانا مرثیہ حضرت عباسؑ پڑھ دوں اکبری صاحب مرحوم کے یہاں کی قدیمی مجلس ہے۔ میری صحت اس قدر خراب ہوگئی کہ مناسب طریقے پر پڑھتے نہ بنے گا۔ بہر حال کوشش کرونگا۔ انشاءاللہ۔

میرے لڑکے احمد رضا سلمہٗ جواب دوبئی میں ہیں میرے مرثیے چھپوانے کی فکر میں ہیں بشرطیکہ کوئی صاحب صحیح اور مناسب طور پر صحت کے ساتھ چھپوادیں۔ یہ ۲۰ مرثیے ہیں۔ بہت اچھا ہوا کہ آپ نے قیصر صاحب کے مرثیے چھپوادیے۔ میں آپ کے ہر مرثیے کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔

دُعا گو۔

آل رضا "

● ● ●

آلِ رضا کی اصلاحیں

(وحید الحسن ہاشمی کے کلام پر اصلاح)

میرے بڑے بھائی مولانا محبوب الحسن ہاشمی علامہ آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے ان کے پاس اکثر مرحوم کے خطوط آیا کرتے تھے کبھی کبھار ایسے بھی خط آتے تھے جن میں غزلوں یا سلاموں پر اصلاح ہوتی تھی میں بھی ان خطوط کو پڑھا کرتا تھا اور اصلاح شدہ اشعار پر غور کیا کرتا تھا ٹوٹی پھوٹی غزلیں میں بھی کہہ لیتا تھا اس لئے میرا بھی جی چاہتا تھا کہ موصوف کو اپنی غزل اصلاح کے لئے روانہ کروں مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔

میں ۱۹۴۴ء میں اپنے ماموں سید کاظم حسین مرحوم کے توسط سے لکھنؤ میں علامہ مرحوم سے ملا اور ان کی فرمائش پر ایک غزل سنائی جب میں نے درج ذیل شعر پڑھا تو علامہ نے ایک ساعت میں اسی شعر کو ذراسی تبدیلی کے ساتھ دہرا دیا یہ ان کی اصلاح کا طریقہ تھا۔

(اصل شعر) مبارک مبارک شہیدِ محبت .... کہ اس راہ میں موت بھی زندگی ہے

(اصلاح شدہ) .... کہ اس راہ میں موت ہی زندگی ہے

اس کے بعد جب میں غزل یا سلام کہتا تو اپنے والد یا بڑے بھائی کو دکھلا لیا کرتا تھا۔ پھر مرحوم سے اصلاح طلب ہوتا تھا۔

میں قیام پاکستان کے بعد کراچی میں سکونت پذیر ہو گیا تلاش معاش میں ایسا سرگرداں ہوا کہ شعر و شاعری رخصت ہو گئی کچھ عرصے بعد مجھے علم ہوا کہ سید آل رضا مرحوم کراچی میں ہیں مگر میں ان سے نہ مل سکا۔ ۱۹۴۸ء میں اپنے سلام اور نوحوں کا مجموعہ "الصراط" میں نے بغیر اصلاح کراچی ہی سے شائع کر دیا اس کا ایک ایک نسخہ اکثر شعرائے کراچی کو ارسال کیا اور خطوط میں تحریر کر دیا کہ مہربانی فرما کر مطالعے کے بعد میری کوتاہیوں سے مجھے باخبر فرمائیں مقام مسرت ہے کہ سید آل رضا مرحوم نے نہ صرف کلام کی غلطیاں نکالیں بلکہ مصرعوں کی اصلاح بھی کر دی۔ مرحوم کے اس عمل سے میرے دل میں انکی عظمت دوبالا ہو گئی۔ میں ۱۹۴۹ء میں لاہور آ گیا بڑی کدوکاوش اور سفارش کے بعد مجھے سول سکریٹریٹ میں ایک ملازمت مل گئی۔ جب یہ خبر وطن میں

پہنچی تو میری والدہ مرحومہ کے ہمراہ دو میرے سگے بھائی اور چار ماموں زاد اور خالہ زاد بھائی لاہور آکر ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگے۔ رہائش کے پیش نظر مجھے چار پانچ سال میں کئی مکان تبدیل کرنا پڑے۔

فراغت کے اوقات میں سلام اور غزل کہتا رہا اور پروفیسر وزیر الحسن عابدی اور علامہ سہیل بلگرامی سے مشوروں کے بعد انھیں کتابی شکل میں شائع کرتا رہا۔ ۱۹۵۶ء میں سید آل رضا مرحوم کا باقاعدہ شاگرد ہوا اور اپنا کلام ڈاک کے ذریعے انھیں ارسال کرنے لگا۔

سید آل رضا عظمت انسانی کے نمائندہ تھے اور مختلف اصناف سخن پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔

ن کی اصلاح سخن کی چند خصوصیات درج ذیل ہیں۔

۱)۔ سید آل رضا مرحوم پاکستان میں لکھنوی تہذیب اور لکھنوی انداز سخن کے سب سے بڑے نمائندہ تھے خیال سے زیادہ وہ زبان پر توجہ دیتے تھے تلفظ الفاظ اور محاورات پر جان چھڑکتے تھے وہ اپنے شاگردوں میں بھی یہی خصوصیات دیکھنے کے متمنی تھے میں نے معرکتہ الارا اور رہائش کے الفاظ استعمال کئے تو انھوں نے فوراً انھیں معرکہ آرا اور سکونت کر دیا۔

پنجاب کے مزاج و اسلوب کے تحت میں نے کہا تھا۔

اللہ بولتا ہے وفا کی زبان میں

انھوں نے مصرع یوں تبدیل کیا

تہذیب بولتی ہے وفا کی زبان سے

یہ لکھنؤ اسکول کے اسلوب کی عمدہ مثال ہے۔

(۲)۔ ناسخ اور عشق لکھنوی کی طرح جلال لکھنوی نے بھی ڈیڑھ سو الفاظ متروک قرار دئے چونکہ آل رضا مرحوم کا جلال لکھنوی اسکول سے تعلق تھا اس لئے انھوں نے بھی یاں 'واں' پر بمعنی لیکن 'گر' 'اُٹھا' 'دن بہ دن' 'تلک' 'بھیتر' بمعنی اندر 'آوے' 'جاوے' 'کھاوے' 'سدا' بمعنی ہمیشہ' مجرایا

مجرئی شوروغل زعب وداب بقسم کے الفاظ استعمال نہیں کئے اور اگر کسی شاگرد سے یہ غلطی سرزد ہو جاتی تھی تو ان کی طبیعت منغض ہو جاتی تھی۔

(۳)۔ سید آل رضا مرحوم خود کہتے تھے کہ میں عروضی نہیں مگر انھوں نے میرے کلام میں ایطائے خفی ایطائے جلی شاتگاں شتر گربہ نقصِ تخییل تعقید تنافر لفظی کے عیوب نکالے اور دوسرے شاگردوں کو بھی ان عیوب سے آشنا کیا۔

(۴)۔ آل رضا مرحوم قوانی کے معاملے میں نہایت سخت تھے وہ ہاتھ اور بات یاد اور بعد جینا پینا کے ساتھ مدینہ اور سکینہ کے قوانی کو پسند نہیں کرتے تھے انھوں نے میرے ایک شعر میں ذکرِ فاطمہ اور شانِ مرتضیٰ کے قافیے کو کاٹ دیا اور تحریر کیا کہ فقط فاطمہ اور مرتضیٰ ہم قافیہ ہیں اضافت کے ساتھ درست نہیں اسی طرح فوراً کا قافیہ چمن اور وطن مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

(۵)۔ شعر میں الف واؤ اور یائے گرائے جاتے ہیں مگر استاد مرحوم کی ہدایت تھی کہ لفظ کا حرف اصلی گرانا مناسب نہیں مثلاً۔

پانی پہ بہتے ہوئے پھول ہیں خوشرنگ بہت

اس مصرع میں پانی کی "یائے" اصلی گری تو صرف پان رہ گیا۔

یا یہ مصرع۔

جب بانو کو تقدیر نے اکبر سے چھڑایا

یہاں بانو کا "واؤ" اصلی گرا تو بان رہ گیا۔

استاد مرحوم اضافت کے ساتھ اعلان نون کے قائل نہیں تھے مثلاً رنگِ آسمان اکبر جوان دریائے خون بہار گلستان وغیرہ۔

(۶)۔ استاد مرحوم کہا کرتے تھے کہ صنعتوں کے لئے شعر نہ کہنا چاہئے ہاں اگر کوئی صنعت بے ارادہ شعر میں آ کر شعر کا حسن بڑھا دے تو احسن ہے مگر وہ مبالغے اور غلو کے شدید مخالف تھے۔ قول

نبیؐ اور اقوال آئمہؑ کے استعمال کے سلسلے میں پوری تحقیق کے بعد الفاظ استعمال کرتے تھے۔

میں نے اپنے ایک شعر میں یزید کے متعلق سوقیانہ لفظ استعمال کیا جسے استاد مرحوم نے یہ کہہ کر کاٹ دیا کہ اگرچہ یزید اس سے بڑھ کر بُرے لفظ کا سزاوار ہے مگر تنظیم مرثیہ ایسے لفظ کو برداشت نہیں کرتی۔ مرحوم کا قول تھا کہ ہر صنف سخن کی مخصوص **Vocabulary** ہوتی ہے اسے اسی صنف میں استعمال کریں تو ابلاغ جلد ہو جاتا ہے غزل کا لفظ مرثیے میں آ کر یا مرثیے کا لفظ غزل میں جا کر اجنبی ہو جاتا ہے مشاق شعرا کبھی کبھی حسن پیدا کرنے کے لئے ایک صنف کے الفاظ کو دوسری صنف میں قرینے سے استعمال کر لیتے ہیں مثلاً میر انیس تلوار کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

کاٹھی سے اسطرح ہوئی وہ خوبرو جدا
جیسے کنار شوق سے ہو ماہرو جدا

(۷)۔ مرحوم کا طریقہء اصلاح یہ تھا کہ وہ الفاظ میں ردّ و بدل کرتے تھے کسی شاگرد کا خیال بدلنے سے گریز کرتے تھے کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے اکثر پورا شعر تبدیل کر دیتے تھے وہ اپنا خیال محفوظ رکھ کر شاگرد کے خیال کی یوں اصلاح فرماتے تھے کہ شعر زمین سے آسمان پر پہنچ جاتا تھا۔ ان کے کئی شاگرد تھے اور ہر ایک کا رنگِ سخن دوسرے سے جدا ہوتا تھا مرحوم کی یہ خوبی تھی کہ جس کا جو رنگ ہوتا تھا اسی رنگ میں اصلاح کرتے تھے۔ وہ لسانی اور عروضی پہلو کے ساتھ ساتھ معانی اور ان کے تلازمات کا خاص خیال رکھتے تھے۔ میں ان کے شاگردوں میں سب سے زیادہ کمسن اور کمزور تھا اس لئے مرحوم کی مجھ پر عنایت خصوصی تھی۔ اہم شاگرد لسانی اور عروضی غلطی نہیں کرتے تھے اس لئے مرحوم کی توجہ ان کے خیال کی باریکی اور نزاکت پر ہوتی تھی۔

(۸)۔ اکثر شاگرد ایک ہی صفحے پر خط اور کلام دونوں تحریر کر دیتے تھے مجبوراً استاد مرحوم کو اصلاح کے بعد کلام کو دوسرے کاغذ پر لکھنا پڑتا تھا۔ اس مشقت سے انھیں شدید تکلیف ہوتی تھی

مگر وہ شاگرد کو پھر سے لکھنے پر مجبور نہیں کرتے تھے اور خود کو تکلیف کا مکلف بنا لیتے تھے۔ مرزا غالب نے بھی اسی مرض کا اپنے خطوط میں ذکر کیا ہے سید آل رضا بھی اپنے خطوط میں تحریر کرتے رہتے تھے کہ کلام کو الگ ورق پر صاف لکھ کر بھیجا کریں۔

(۹)۔ سید آل رضا کے استاد علامہ آرزو لکھنوی کہا کرتے تھے کہ جب اُردو میں موزوں اور مناسب الفاظ موجود ہوں تو عربی اور فارسی الفاظ کے استعمال سے کیا فائدہ۔ اسی نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے لئے انھوں نے نظم کی ایک کتاب ''سریلی بانسری'' لکھی جس میں عربی فارسی کے وہی الفاظ استعمال کئے جو موزوں ہو چکے تھے آل رضا مرحوم بھی عربی اور فارسی کے موٹے موٹے اور گرانڈیل الفاظ کے اُردو میں استعمال کے مخالف تھے ان کی کوشش ہوتی تھی کہ آسان اور عام فہم الفاظ سے نایاب اور بلند معنی پیدا کئے جائیں جہاں کہیں عربی اور فارسی الفاظ سے معنی میں حُسن یا بلندی پیدا ہو انھیں استعمال کرنے میں کوئی ہرج نہیں دیکھتے میں نے انسان کی جبلت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

ہر رہگذر کا راہبر و رہنما کہیں
دل اسکا چاہتا ہے دو عالم خدا کہیں

استاد مرحوم نے اسے یوں کر دیا۔

بگڑی ہوئی ہے بات خدا جانے کیا بنے
اب آدمی کو فکر یہی ہے خدا بنے

(۱۰) سید آل رضا کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کے اچھے اشعار کی داد دیتے تھے اور دوسرے ہم عصر شعرا کے عمدہ شعر کی نہ صرف زبان سے بلکہ تحریر کے ذریعے تعریف کرتے تھے حضرت نجم آفندی نے ۱۹۳۸ء میں ایک سلام کہا جس کے ایک شعر پر استاد مرحوم اس قدر خوش ہوئے کہ انھوں نے نجم آفندی کو حیدر آباد دکن کے پتے پر خط لکھ کر ان کے اس شعر کی داد دی۔ میں نے نجم مرحوم سے اس بات کا ذکر کیا تو انھوں نے مجھے کراچی سے درج ذیل خط تحریر کیا

جس میں سید آل رضا مرحوم کو عظیم شاعر تحریر کیا گیا ہے۔

۱۸۔ فروری ۱۹۷۱ء

محبی تسلیمات

بھائی۔ آل رضا بھی عجیب آدمی ہیں جب ۳۸ء میں میرے نوحوں کی کتاب لکھنؤ سے شائع ہوئی تو میرے ایک شعر نے ان پر اتنا اثر کیا کہ انھوں نے مجھے ایک خط لکھا جس میں تحریر تھا کہ میں آپ کا یہ شعر پڑھتا ہوں اور روتا ہوں اب اس مضمون کو کوئی کیونکر باندھے گا میں نے ان کے اس خط کو ان کی عالی نفسی پر محمول کیا ا ۷ء میں کراچی کی ایک محفل میں جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو سر محفل انھوں نے اعلان کیا کہ اگر نجم کے نوحے نہ ہوتے تو میں مرثیہ نہ کہہ سکتا۔ صاحب۔ میں نے ان کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا لیکن انھوں نے بہانگ دہل یہی الفاظ پھر دہرائے۔ صاحب۔ آل رضا اس دور کے عظیم شاعر اور عظیم مرثیہ گو ہیں خصوصیت سے کراچی میں ان کی پوجا ہوتی ہے ان کے منہ سے ایسے الفاظ کا نکلنا میرے لئے باعثِ طمانیت تو ہے ہی لیکن میں سوچتا ہوں کہ یہ کتنا عظیم انسان بھی ہے۔ وہ شعر درج ذیل ہے۔

صبح محشر تک ٹھہرنا تھا شبِ عاشور کو شمع رکھ کر روئے اکبر دیکھنے بیٹھی تھی ماں

نیاز کیش۔ نجم آفندی

یہ بات پورے متحدہ ہندوستان میں مانی ہوئی تھی کہ علامہ آرزو میں اصلاح دینے کا جو ملکہ قدرت نے ودیعت کیا تھا وہ کسی دوسرے شخص کو حاصل نہ تھا۔ سید آل رضا انہی کے شاگرد رشید تھے اور جس عمدگی اور جس مہارت سے وہ اصلاح دیتے تھے اسکی داد نہ دینا بخل ہے۔

سید آل رضا آج منوں مٹی کے نیچے آرام کر رہے ہیں مگر شعر و شاعری اور قرینۂ اصلاح زبان و بیاں کا جو پودا لگا گئے تھے اب وہ چھتنار درخت بن گیا ہے اور اس درخت کی شاخوں پتوں اور پھلوں سے آل رضا مرحوم کی نیت محبت اور مشقت کی خوشبوئیں نکل کر شعرا کے مشام جاں کو معطر کر رہی ہیں ہمارا سلام ہو ان کی پاک روح پر۔

اب ذیل میں آل رضا مرحوم کی چند اصلاحیں اصل متن کے ساتھ پیش کی جا رہی ہیں۔ ملاحظہ فرمائے۔

قبلِ اصلاح	بعدِ اصلاح
(غزل)	
الٹا معاملہ ہے محبت کی راہ میں	مرنے کا ذکر ہے کہ یہ جینے کی بات ہے
جو ہو گیا شہید اسی کی حیات ہے	....
بہر تسکین غم کچھ کرو دوستو	آؤ تسکین غم کچھ تو ہو دوستو
میں تو روتا ہوں تم تو ہنسو دوستو	میں بھی ہنستا ہوں تم بھی ہنسو دوستو
جاگنا ہے نمودِ سحر تک مجھے	....
رات بھیگی ہے تم سو رہو دوستو	رات آئی ہے تم سو رہو دوستو
مجھے تو اشکِ مسلسل نے دیکھنے نہ دیا	....
وہ لوگ دیکھیں گے آئی ہیں جن کو راس آنکھیں	وہ لوگ بھی تو ہیں آئی ہیں جن کو راس آنکھیں
وحید چھوڑ دو اس دیس سے وفا کی امید	یہ دید و کشتگیِ دید اے معاذ اللہ
جہاں بجھاتی ہیں قلب و نظر کی پیاس آنکھیں	کہیں بجھاتی ہیں قلب و نظر کی پیاس آنکھیں
جو دیکھ کر انھیں پہروں حواس میں نہ رہیں	بتوں کو جلوہ نمائی اگر عطا کی ہے
خدا نے دی ہیں مجھے وہ ادا شناس آنکھیں	خدا نے دی ہیں مجھے بھی ادا شناس آنکھیں
انہی کے گرد نگاہیں انہی کا جلوۂ رخ	وہ اس طرح سے گزرتے ہیں اس طرف سے وحید
نہ میرے پاس تجلی نہ میرے پاس آنکھیں	نہ دیکھنے کا مجھے حق نہ میرے پاس آنکھیں
دنیا نے دے دیا ہے جسے آدمی کا نام	ہو آدمی کا ذکر تو پھر کیوں سنائیے
اک داستاں کہ اصل کہانی سے کٹ گئی	وہ داستاں جو اصل کہانی سے کٹ گئی

قبلِ اصلاح	بعدِ اصلاح
فریب راہ محبت کا آسرا بھی نہیں	ملے گی آپ ہی منزل یہ آسرا بھی نہیں
میں جا رہا ہوں مگر کوئی راستا بھی نہیں	....
ہر ایک کہتا ہے راہ وفا ہے ناہموار	اسے گلہ ہو کہ راہ وفا ہے ناہموار
مگر خلوص سے اک آدمی چلا بھی نہیں	خلوص سے جو کبھی دو قدم چلا بھی نہیں
عجیب طرفگی شوق ہے کہ سوئے عدم	عجیب طرفگی رہروی کہ سوئے عدم
گئی ہے خلق مگر کوئی نقشِ پا بھی نہیں	....
روک لی ہے زمانے نے میری زباں	تا بہ کے تا بہ کے چپ رہوں
حق کی خاطر سہی کچھ کہو دوستو	کچھ کہو کچھ کہو کچھ کہو دوستو
روز روشن کو تاریکیاں کھا گئیں	....
دل جلا کر اجالا کرو دوستو	شمعِ دل کا اجالا کرو دوستو
اب گلستاں پہ پہرے ہیں صیاد کے	اب گلستاں گلستاں بہاریں کہاں
اب بیاباں بیاباں پھرو دوستو	....
یہ ظلم کا سیلاب گزر جائے گا اک دن	....
جو مارنے والا ہے وہ مر جائے گا اک دن	دریا جو چڑھا ہے وہ اتر جائے گا اک دن
دیدنی ہے بزم میں سوزِ محبت کا اثر	تم کبھی منہ سے وفا کا نام لے سکتے نہیں
شمع کب کہتی ہے پروانوں سے پروانہ ہوں میں	شمع ہرگز کہہ نہیں سکتی کہ پروانہ ہوں میں

قبلِ اصلاح	بعدِ اصلاح
ترے شوق پر ہے یہ اب منحصر	یہ اب منحصر ہے ترے شوق پر
محبت سے بچ یا محبت میں جل	محبت نہ کر یا محبت میں جل
ایک منزل ہو تو راہوں کے جدا ہونے سے کیا	یہ زبانِ عشق ہے دنیا سمجھ سکتی نہیں
کہہ رہا ہے مجھ سے کچھ دیوانہ دیوانے سے میں	....
پہنائے تو پاؤں میں ہمارے کوئی زنجیر	پہنائے تو ہم اہلِ وفا کو کوئی زنجیر
ہر شے میں نظر آئے گی زنجیر ہی زنجیر	ہر سمت نظر آئے گی زنجیر ہی زنجیر
وہ بخششِ اغیار نہ تھی اہلِ جنوں کو	کیا روکتے اغیار مری جرأتِ رفتار
مجھ کو مرے احباب نے پہنائی تھی زنجیر	....
مقصود نہیں دلشکنی آپ کی ورنہ	کچھ وقت کی آواز کا احساس ہے ورنہ
چاہوں تو ابھی توڑ کے رکھ دوں ابھی زنجیر	....
کسی کے ایک اشارے پہ دو جہاں رقصاں	کسی کے واسطے نغمہ کسی کے واسطے نے
مرے لئے مری زنجیر کی صدا بھی نہیں	....
کوئی مقام ہو اک آسرا تو ہوتا ہے	کسی کا زور نہیں مرگ و زندگانی پر
وہ یوں بدل گئے جیسے مرا خدا بھی نہیں	....
زندگی کی تڑپتی ہوئی لاش پر	....
لوگ گریاں ہیں تم خوش رہو دوستو	کوئی گریاں ہو تم خوش رہو دوستو

قبلِ اصلاح	بعدِ اصلاح
ہر خوشی کا مری ساتھ دیتے تھے تم	ساتھ میری خوشی کا دیا تھا بہت
اب مرے غم کا بھی ساتھ دو دوستو	....
پشیمانی حُسن پر مر رہا ہوں	پشیماں کیا حسنِ برہم کو میں نے
بڑی مات کھائی انھیں مات کرکے	....
غرور و ناز سے بڑھتا ہے جذب خودرائی	نگاہ پھیر کے اپنے تمام وعدوں سے
وہ یوں بدل گئے جیسے مرا خدا بھی نہیں	....
وہ جان و دل کی رقیب اجنبی شناس آنکھیں	رہیں مقامِ تحیّر میں با حواس آنکھیں
مری نہیں ہیں بظاہر میں میرے پاس آنکھیں	اُدھر ادائیں اِدھر یہ ادا شناس آنکھیں
ہم بھی تیار ہیں آتی ہے تو موت آئے ابھی	چار دن بعد جو ہونا ہے وہ ہو جائے ابھی
ہم بھی مشتاق ہیں آتی ہے تو موت آئے ابھی	....

(سلام)

قبلِ اصلاح	بعدِ اصلاح
حُبِّ حسین دین کے ہر ضابطے میں ہے	....
جو عاشقِ حسین نہیں بتکدے میں ہے	جو کربلا نواز نہیں بتکدے میں ہے
کونین کو حسین توانائی دے گئے	سرورِ نگاہِ خلق کو گہرائی دے گئے
اندھی قیادتوں کو وہ بینائی دے گئے	....
جو شکستہ خاطر تھا آج اس کے چرچے ہیں	....
جس نے فتح پائی تھی اب وہ ہاتھ ملتا ہے	جس نے فتح سمجھی تھی اب وہ ہاتھ ملتا ہے

قبلِ اصلاح	بعدِ اصلاح
اسلام پہ جوانی اکبر کا فیض ہے	اسلام کے شباب پہ اکبر کا فیض ہے
جو قوم کی حیات کو انگڑائی دے گئے	....
ہنگام عصر تیرونے رخ تھا اٹا ہوا	مجروح وقت عصر بہر طور تھی جبیں
کیا جانے کس طرح کیا سجدہ حسین نے	....
کچھ ایسی بہر حق تپش غم ہوئی نصیب	کچھ ایسا راہ حق میں رہا ذوق غم عزیز
مر کر بھی کی جفا کی تمنا حسین نے	....
مرنے کی رضا لیکے بھرے گھر کو نہ دیکھا	مرنے کی رضا لیکے پھر اس گھر کو نہ دیکھا
یہ شوقِ شہادت تھا کہ مادر کو نہ دیکھا	....
میت شبیر پہ کچھ تو ترس کھایا گیا	میت شبیر پہ گھوڑوں کو دوڑایا گیا
لاشۂ مسلم مگر کوفے میں لٹکایا گیا	لاشۂ مسلم اگر کوفے میں لٹکایا گیا
ایک جہاں ہے نہر میں ڈوبا	فوج عدو میں پانی پانی
شاہ کے بچے نہر کنارے	پیاسے بچے نہر کنارے
یہ جو انداز محبت ترا تخیلی ہے	یہ جو انداز طریقت ترا تخیلی ہے
تو نے کم ظرف کی آنکھوں سے کہیں پی لی ہے	....
الفت آلِ محمدؐ کی ڈگر سے ہٹ کر	ہٹ کے تم راہ مودّت سے کہاں جاتے ہو
جس زمیں پر بھی چلو گے وہ زمیں گیلی ہے	پاؤں دیکھو نہ پھسل جائیں زمیں گیلی ہے

قبلِ اصلاح	بعدِ اصلاح
تم نے اس سن میں امامت کی ندا پر اصغرؔ جان دی ہے کہ حیاتِ ابدی پی لی ہے	اصغرِ تشنہ دہاں تم نے تو اتنے سن میں ....
جس کے ہونٹوں میں نہیں الفتِ حیدر کی مٹھاس بات کیا سانس بھی اس شخص کی زہریلی ہے	جس کے ہونٹوں میں نہیں الفتِ شبیر کا رس ....
سیاہ دل میں جو احساس آگہی لائے حسین ایسی محبت کی روشنی لائے	حسین ساتھ وہ اقدار آگہی لائے کہ موت خود ہی تب و تابِ زندگی لائے
حسینیت پہ زمانے کا اختیار نہیں یہ پھول وہ ہے جو منت کشِ بہار نہیں	غمِ حسین پہ موسم کا اختیار نہیں ....
یزید جبر و تشدد سے جس پہ قابض ہے وہ اقتدار کی میت ہے اقتدار نہیں	جس اقتدار پہ نازاں ہوں پیروانِ یزید ....
حسینیوں کا شہادت گہِ محبت میں وہ حوصلہ ہے قضا کا بھی انتظار نہیں	حسینیوں کا محبت گہِ شہادت میں وہ حوصلہ ہے کہ مرنا بھی ناگوار نہیں
لاشِ کڑیل جواں اٹھائے کون	لاشۂ نوجواں اٹھائے کون
جز اہلبیت رتبۂ عصمت کسے ملا	دھبہ نہ آسکا تو اسی خاندان پہ انگلی نہ اٹھ سکی تو اسی خاندان پہ
شہ کا وحید کہنا وہ بھولا نہیں ہے	عباس کیا کروں میں کچھ سوجھتا نہیں ہے عباس تم سا بھائی اب دوسرا نہیں ہے

قبلِ اصلاح	بعدِ اصلاح
اکبر کا قلب چھید تو سکتا ہے اے یزید آواز ہمشبیہ پیمبر کو روک لیں	پابندیاں لگا نہیں سکتے اذان پر ....
اے وائے پھرے یوں نہ دردر کھلے سر کوئی	دردر نہ پھرے یوں بھی غمگین کھلے سر کوئی
ہلا کے دشت میں ہے اک ہجومِ جلوۂ نور حسین کتنے چراغوں کی روشنی لائے	ہلا کے دشت میں وہ اہتمام جلوۂ نور ....
حسین تم پہ نہ انسانیت ہو کیوں نازاں جو موت کے ہے مقابل وہ زندگی لائے	.... بنے جو خضر دوامی وہ زندگی لائے
علم تھا فوجِ حسینی کا اس کے ہاتھوں میں لبِ فرات بھی جو شوقِ تشنگی لائے	علم ہے فوجِ حسینی کا اس کے شانے پر ....
نبی کا حکم نہ مانے یہ اختیار تو ہے نبی کا حکم بدلنے کا اختیار نہیں	یہ اختیار کسی مانے نہ حکم نبی ....
جادۂ آلِ محمدؐ میں قدم کا رکھنا صرف دل کی نہیں تقدیر کی تبدیلی ہے	جادۂ آلِ محمدؐ میں قدم رکھ دینا ....
مدح خوانِ شہِ مظلوم ہیں ہم بھی تم بھی ہم پہ تہدید ہے کیوں تم نے زباں سی لی ہے	.... کیوں یہ تہدید ہے ہم پر کہ زباں سی لی ہے

قبلِ اصلاح	بعدِ اصلاح
(مرثیہ) ''ناموسِ وفا''	
نام وفا بلند ہے دنیا جہان سے	....
اللہ بولتا ہے وفا کی زبان سے	تہذیب بولتی ہے وفا کی زبان سے
زینبؑ سے آدمی کے چلن کو بقا ملی	....
زینبؑ سے کائنات کو جنسِ وفا ملی	زینب سے ہمت بشری کو جلا ملی
زخمی کوئی بچا ہی نہیں اسکے وار کا	کیونکر مقابلہ ہو بھلا ایسے وار کا
اسکے بیان میں ہے اثر ذوالفقار کا	....
طوفاں اٹھا جو قلب میں بھائی کی یاد کا	....
بیدار یک بیک ہوا جذبہ جہاد کا	خطبوں کی روح بن گیا جذبہ جہاد کا
اٹھیں شقی کے سبز قدم کیا مجال ہے	....
عابد ہو اور یزید سے کم کیا مجال ہے	زین العبا کا سر ہو قلم کیا مجال ہے
ظلمت کی اس فضا میں اکیلا نہیں حسینؑ	....
زینبؑ بھی ساتھ ساتھ ہے تنہا نہیں حسینؑ	زینب علم بدوش ہے تنہا نہیں حسینؑ
ورثے میں پا کے فاتح بدر و حنین سے	ختم الرسلؐ نہ فاتح بدر و حنین سے
بیٹی علی کی داد طلب تھی حسینؑ سے	....

(مرثیہ) "شبِ عاشور"

قبلِ اصلاح	بعدِ اصلاح
اتنا ہوا شریک خدا کی صفات میں	اتنا ہوا غریق خدا کی صفات میں
جو کہہ دیا وہ ہو کے رہا کائنات میں	....
فخر اسکے رکھ رکھاؤ پہ اہل فلک کریں	....
اسکا جمال دیکھ کے سجدے ملک کریں	اس کے قدم کی خاک پہ سجدے ملک کریں
انداز مختلف ہیں مگر جان ایک ہے	اجساد مختلف ہیں مگر جان ایک ہے
چالیس گھر قیام ہے مہمان ایک ہے	....
اترے اگر نظر سے روش ما وطین کی	....
چاہے تو کھینچ لے وہ طنابیں زمین کی	اک آن میں بدل دے طنابیں زمین کی
سورج کو تاج فکر و نظر کا نگیں کرے	سورج کو مہر لفظ و بیاں کا نگیں کرے
کس کی مجال حکم پہ اس کے نہیں کرے	....
ٹکرا کے خود کو وقت کے جھوٹے وقار سے	....
طاقت کا زعم چھین لیا اقتدار سے	جس نے جلال چھین لیا اقتدار سے
چھالے پڑے نہ شرعِ محمدؐ کے پاؤں میں	....
دینِ خدا کو لے لیا خود اپنی چھاؤں میں	پالا ہے جس نے دینِ خدا اپنی چھاؤں میں
جن و ملک کے ذوقِ عبادت سے پوچھئے	شوقِ دعا نہ ذوقِ عبادت سے پوچھئے
اس رات کا سکوں شبِ ہجرت سے پوچھئے	....

قبلِ اصلاح	بعدِ اصلاح
تارے ہی جانتے ہیں فقط بدر کا وقار	نور بقا ہے شمس کی ضو بدر کے لئے
اس شب کو ہے نصیب شبِ قدر کا وقار	یہ رات آبرو ہے شب قدر کے لئے

(مرثیہ) ''خونِ تبسم''

قبلِ اصلاح	بعدِ اصلاح
دراصل سوزِ غم ہی محبت کا نام ہے	سوزِ ولا دلوں کے دھڑکنے کا نام ہے
یہ دردِ دل نہ ہو تو بشر نا تمام ہے	....
الفت کمالِ ہوش ہے وارفتگی نہیں	....
الفت خودی کا نام ہے یہ بے خودی نہیں	الفت شعور ذات ہے یہ بے خودی نہیں
سیلاب شوق وقت کے دھاروں کو روک دے	....
دل کا گداز ذہن کی آندھی کو ٹوک دے	انسان آسماں کے ستاروں کو روک دے
اس کے بغیر راہ کا پتھر ہے آدمی	اس کے بغیر خاک ہے پتھر ہے آدمی
یہ دم کے ساتھ ہو تو پیمبر ہے آدمی	....
مذہب کی شان حرمت ایماں کی آن ہے	نشرِ علوم مذہب حق کی زبان ہے
حُبِّ نبی نماز خدا کی اذان ہے	....
صحنِ چمن میں عصمت وعفت کے پھول ہیں	چشمِ چمن میں عصمت وعفت کے پھول ہیں
یہ دونوں لال مظہرِ حُبِّ رسولؐ ہیں	دونوں پسر نواسۂ حُبِّ رسولؐ ہیں
چھوٹے سے دل میں زورِ قیامت لئے ہوئے	چھوٹا سا قد ہے وقت کی قامت لئے ہوئے
چھ ماہ میں ابد کی مسافت لئے ہوئے	....

قبلِ اصلاح	بعدِ اصلاح
باہیں پسر کی ننھی سی گردن میں ڈال کے	باہیں گلے میں ڈال کے ارماں نکال کے
رونے لگیں رباب کلیجہ سنبھال کے	....

(مرثیہ) "حسین اور قربانی"

قبلِ اصلاح	بعدِ اصلاح
دوشِ نظر سے چادرِ غیرت اتار کے	....
فاتح بنا ہے دین کی توفیق ہار کے	دنیا لئے ہے دین کی توفیق ہار کے
ہر رہگذر کا راہبر و رہنما کہیں	بگڑی ہوئی ہے بات خدا جانے کیا بنے
دل اسکا چاہتا ہے دو عالم خدا کہیں	اب آدمی کو فکر یہی ہے خدا بنے
کیا کیا فریب آپ سے کرتا ہے آدمی	....
جینے کے انتظار میں مرتا ہے آدمی	جینے کے اشتیاق میں مرتا ہے آدمی
معتوب راستوں سے گزرتا ہے آدمی	خود ساز گمرہی سے گزرتا ہے آدمی
مونسِ رسولؐ بھی ہوں تو ڈرتا ہے آدمی	تسکیں دیں رسولؐ تو ڈرتا ہے آدمی
یہ آدمی کہ بوجھ ہے حق کی اساس پر	الزام رکھ رہا ہے خرد کی اساس پر
یہ آدمی کہ جس کو یقیں ہے قیاس پر	حق پر اسے گماں ہے یقیں ہے قیاس پر
دل کو فریب وقت سے بہلا رہے ہیں لوگ	کتنا حسیں فریبِ نظر کھا رہے ہیں لوگ
منزل کدھر ہے اور کدھر جا رہے ہیں لوگ	دو کشتیوں میں پاؤں ہیں اور جا رہے ہیں لوگ
قربانیاں کرم ہیں مکرم ہیں اہلبیت	....
قربانیوں کے پھول پہ شبنم ہیں اہلبیت	دنیا اگر ہے زخم تو مرہم ہیں اہلبیت

قبلِ اصلاح	بعدِ اصلاح
یہ فکر سب کہیں کہ قیامت کا ڈھنگ ہے	....
اصغرؓ نہیں یہ پھر علی اکبرؓ کی جنگ ہے	اصغرؓ کی یہ دعا نہیں اکبرؓ کی جنگ ہے
واقف ذرا نہیں ہیں مقدر کے پھیر سے	....
ہے گود کا خیال کہ خالی ہے دیر سے	گھبرا رہی ہیں گود جو خالی ہے دیر سے
چہرے پہ خون ہاتھوں پہ لاشہ جگر میں درد	چہرے پہ اپنے لال کا خوں اور جگر میں درد
شبیر چپ کھڑے ہوئے بھرتے ہیں آہ سرد	....
افراط غم کی جھاڑ رہے ہیں بدن سے گرد	زخموں کو پیار کرنے لگی کربلا کی گرد
آئے نظر پسر کے جو رخسار زرد زرد	دیکھا جو اپنے چاند کے رخسار زرد زرد
آئینۂ خیال پریشاں ہے آدمی	اک مستقل خیال پریشاں ہے آدمی
زندہ ہے زندگی سے گریزاں ہے آدمی	خود اپنی زندگی سے گریزاں ہے آدمی
ہر محفل وجود میں ہے آدمی کی بات	خنجر ہے آدمی کے لئے آدمی کی بات
اسکی نظر کی ضرب سے مضطر ہے کائنات	خود رنگی کے زہر سے مضطر ہے کائنات
اب بھی اٹا ہے حسن کا آئینہ دھول سے	دھندلا ہے دل کا آئینہ دنیا کی دھول سے
اب بھی گلاب پست ہے کاغذ کے پھول سے	....
ایثار جسم و جاں کی کوئی گفتگو نہیں	....
اسکی کتاب دل میں فقط من ہے تو نہیں	اب کائنات دل میں فقط من ہے تو نہیں

بعدِ اصلاح	قبلِ اصلاح
حق ان کے ساتھ ہے جو مٹے ہیں برائے حق	کیا اجر ہے جو ہو گئے قرباں برائے حق
....	ٹھہری ہے ایک نفس کی قیمت رضائے حق
جو زندگی میں نفس کی خواہش سے دور ہے	جو لوگ توڑ دیتے ہیں آئینہ ذات کا
وہ آدمی امام ہے وحدت کا نور ہے	کہتے ہیں ہم امام انھیں کائنات کا
ناوک چلا جو دشت میں کمسن شہید پر	تیرِ ستم چلا تھا جو کمسن شہید پر
....	جا کر لگا دمشق میں قلبِ یزید پر
اہرام کفر و شرک کی بنیاد ہل گئی	اب نصرتِ حسین سے تقدیر کھل گئی
....	قربانیِ حیات کو معراج مل گئی

اشاریہ

(سید وحید الحسن ہاشمی کی شخصیت اور فن پر لکھی گئی تحریریں)

مرتبہ: عباس رضا

maablib.org

اشاریہ

(سید وحید الحسن ہاشمی کی شخصیت اور فن پر لکھی گئی تحریریں)

عباس رضا

بیسویں صدی میں تقسیم برصغیر کے بعد پاکستان میں جن ادیبوں اور شاعروں کی قدر افزائی ہوئی' ان میں سید وحید الحسن ہاشمی کا نام سرفہرست ہے۔ ہندوپاک کے تمام نامور ادیبوں اور شاعروں نے ہاشمی صاحب کی شخصیت اور فن پر اپنے گرانقدر خیالات نثری و شعری صورتوں میں پیش کیے۔ اسی طرح تمام معتبر ناقدین نے ہاشمی صاحب کی نثری و شعری خدمات کا اعتراف کیا اور مضامین و مقالات تحریر فرما کر اس منفرد تخلیق کار کی ہنر مندیوں کو سراہا۔ راقم الحروف نے چند برس پیشتر وحید الحسن ہاشمی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے ایک کتاب ''وحیدِ عصر'' ترتیب دی تو ان میں سے چند نثری و شعری تخلیقات کو یکجا کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہاشمی صاحب کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اُسے کسی ایک جلد میں جمع کرنا سہل نہیں۔ زیر نظر مقالے میں راقم الحروف نے ان دستیاب نثری و شعری تخلیقات کی ایک فہرست ترتیب دی ہے جو شعرا ناقدین اور ادباء نے ہاشمی صاحب کے بارے میں تحریر کی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس یگانۂ روزگار شخص پر ایک مرتبہ پھر نئے سرے سے کام کیا جائے اور نصف صدی کو محیط کی علمی و ادبی کاوشوں کا از سر نو مقام و مرتبہ متعین کیا جائے۔ آپ کو اس فہرست سے اندازہ ہو جائے گا کہ سید وحید الحسن ہاشمی صاحب کے بارے میں کن کن شخصیات نے اپنی آرا پیش کی ہیں۔ راقم الحروف نے تمام مقالات کو نمایاں اصناف میں تقسیم کر دیا ہے تا کہ قارئین کو آسانی رہے اور اپنی دلچسپی کے موضوع پر زیادہ توجہ دے سکیں۔

۔ شخصیت

۔	عاصی کرنالی ڈاکٹر	حسن بزار شیوہ (مطبوعہ: وحید عصر، لاہور ۔ ۱۹۹۸ء)
۔	احمد عقیل روبی پروفیسر	"وحید الحسن ہاشمی ۔ بادل کا ٹکڑا" (وحید عصر)
ا۔	حسن عسکری کاظمی، پروفیسر	ہاشمی صاحب ۔ چند یادیں چند باتیں (وحید عصر)
ا۔	عبدالکریم خالد پروفیسر	تہذیب و ادب کی زندہ علامت ۔ سید وحید الحسن ہاشمی (ماہنامہ خواجگان ۲۰۰۱ء)
۔	اجمل نیازی ڈاکٹر	وحید الحسن ہاشمی ۔ ایک تہذیبی شخصیت (ماہنامہ شام و سحر دسمبر ۲۰۰۲ء)
۔	فخر الحق نوری ڈاکٹر	وحید الحسن ہاشمی ایک ہمہ جہت شخصیت (ماہنامہ شام و سحر دسمبر ۲۰۰۲ء)
۷۔	طارق عزیز ڈاکٹر	ہاشمی یاران وطن (ماہنامہ شام و سحر دسمبر ۲۰۰۲ء)
۸۔	عبدالکریم خالد پروفیسر	ہاشمی صاحب ۔ بحر بے کراں (ماہنامہ شام و سحر دسمبر ۲۰۰۲ء)

۲۔ مرثیہ

۱۔	انتظار حسین	وحید الحسن ہاشمی کے مرثیے کا فن (ماہنامہ شام و سحر دسمبر ۲۰۰۲ء)
۲۔	آغا سہیل ڈاکٹر	وحید الحسن ہاشمی اور جدید مرثیے (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)
۳۔	سلیم اختر ڈاکٹر	وحید الحسن ہاشمی کے مرثیے (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)
۴۔	مسعود رضا خاکی ڈاکٹر	وحید الحسن ہاشمی کی مرثیہ گوئی (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)
۵۔	مظفر عباس ڈاکٹر	اردو مرثیے کے وحید العصر (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)
۶۔	حسن رضوی ڈاکٹر	وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں میں احساس تحیر (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)
۷۔	علی حسین رضوی	ایک مرثیہ گو ۔ ایک سیرت نگار (غیر مطبوعہ)
۸۔	متین اے شیخ	وحید الحسن ہاشمی ۔ ایک رثائی شاعر (غیر مطبوعہ)
۹۔	علی عباس سید	وحید الحسن ہاشمی ایک منفرد مرثیہ گو (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)
۱۰۔	شبیہ الحسن ڈاکٹر	ایک معتبر مرثیہ نگار ۔ وحید الحسن ہاشمی (اردو مرثیہ اور مرثیہ نگار لاہور ۲۰۰۳ء)
۱۱۔	محمد اشرف پروفیسر	وحید الحسن ہاشمی کی مرثیہ نگاری (حسین اور قربانی لاہور ۱۹۷۷ء)
۱۲۔	میمونہ انصاری ڈاکٹر	وحید الحسن ہاشمی کا مرثیہ ناموس وفا (العطش جلد ۱: لاہور ۱۹۸۹ء)
۱۳۔	خواجہ محمد زکریا ڈاکٹر	وحید الحسن ہاشمی کا مرثیہ خون تبسم (العطش جلد ۱: لاہور ۱۹۸۹ء)

۱۴۔ سرفراز حسین قاضی ڈاکٹر — وحید الحسن ہاشمی کا مرثیہ شب عاشور (العطش جلد: ا لاہور ۱۹۸۹ء)
۱۵۔ سید سجاد رضوی پروفیسر — وحید الحسن ہاشمی کا مرثیہ خلق حسنؑ (ایضاً۔۱۹۸۹ء)
۱۶۔ عاصی کرنالی ڈاکٹر — وحید الحسن ہاشمی کا مرثیہ حسینؑ اور قربانی (ایضاً۔۱۹۸۹ء)
۱۷۔ خیال امروہوی ڈاکٹر — وحید الحسن ہاشمی کا مرثیہ زندگی (ایضاً ۱۹۸۹ء)
۱۸۔ عتیق احمد پروفیسر — وحید الحسن ہاشمی کا مرثیہ صبر (ایضاً ۱۹۸۹ء)
۱۹۔ محمد اجمل نیازی ڈاکٹر — وحید الحسن ہاشمی کا مرثیہ سفیر آل محمدؐ (العطش ج۔ ا لاہور ۱۹۸۹ء)
۲۰۔ آغا سہیل ڈاکٹر — وحید الحسن ہاشمی کا مرثیہ ملیکۃ العرب (ایضاً ۱۹۸۹ء)
۲۱۔ سہیل احمد خان ڈاکٹر — وحید الحسن ہاشمی کا مرثیہ زنجیر سفر (ایضاً ۱۹۸۹ء)
۲۲۔ عبید اللہ خان ڈاکٹر — وحید الحسن ہاشمی کا مرثیہ سرکار وفا (ایضاً ۱۹۸۹ء)
۲۳۔ اسرار زیدی — وحید الحسن ہاشمی ایک اسلوب نگار (ماہنامہ شام و سحر اکتوبر ۲۰۰۱ء)
۲۴۔ مظفر حسین ظفر جونپوری پروفیسر — وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں کا مطالعہ (غیر مطبوعہ)

۳۔ غزل

۱۔ عاصی کرنالی ڈاکٹر — وحید الحسن ہاشمی کی غزل گوئی (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)
۲۔ ساحر لکھنوی — شعراب۔ایک جائزہ (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)
۳۔ علی ظہیر منہاس ڈاکٹر — شعراب۔ایک مطالعہ (ایضاً)
۴۔ ہامون ایمن — ژرف نگاہ شاعر۔سید وحید الحسن ہاشمی (ایضاً)
۵۔ شاہین بھٹی پروفیسر — وحید الحسن ہاشمی ایک منفرد شاعر (غیر مطبوعہ)
۶۔ سید جمیل احمد رضوی — سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری عظمت (غیر مطبوعہ ۱۹۹۳ء)

۴۔ نعت

۱۔ حنیف اسعدی — سید وحید الحسن ہاشمی کی نعت نگاری (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)
۲۔ حسن عسکری کاظمی پروفیسر — یاسین پر ایک طائرانہ نظر (روزنامہ مساوات لاہور ۱۳۔فروری ۱۹۹۸ء)
۳۔ ظفر الحق چشتی پروفیسر — یاسین اور فن نعت نگاری (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)
۴۔ عارف ثاقب ڈاکٹر — وحید الحسن ہاشمی کی نعت گوئی (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)

۵۔	ہادی نقوی	افقِ نعت کا خورشید تاباں (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)
۶۔	ذوالفقار علی پروفیسر	ایک معروف نعت گو سید وحید الحسن (غیر مطبوعہ)
۷۔	سید محمد رضا زیدی	سید وحید الحسن ہاشمی کا مجموعہ نعت یاسین (غیر مطبوعہ ۱۹۹۷ء)

۵۔ منقبت

۱۔	سجاد باقر رضوی ڈاکٹر	وحید الحسن ہاشمی کی منقبت نگاری (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)
۲۔	خیال امروہوی ڈاکٹر	بارگاہ رسالت و امامت اور وحید الحسن (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)
۳۔	سحر انصاری ڈاکٹر	وحید الحسن ہاشمی۔ چند تاثرات (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)
۴۔	محمد سعید معز الدین ڈاکٹر	سید وحید الحسن ہاشمی ایک دردمند شاعر (ماہنامہ شام و سحر لاہور دسمبر ۲۰۰۱ء)

۶۔ نظم

۱۔	عبدالکریم خالد پروفیسر	وحید الحسن ہاشمی کی نظم اور حالی کی شعری روایت (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)

۷۔ سلام

۱۔	اجمل نیازی ڈاکٹر	سید وحید الحسن ہاشمی کی سلام نگاری (ایضاً ۱۹۹۸ء)
۲۔	عظمیٰ عزیز پروفیسر	سید وحید الحسن ہاشمی کی سلام نگاری کا مطالعہ
۳۔	عنبرین خان	سید وحید الحسن ہاشمی بحیثیت سلام نگار (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)
۴۔	ہارون قادر پروفیسر	وحید الحسن ہاشمی کی سلام نگاری (غیر مطبوعہ)

۸۔ نوحہ

۱۔	حسن عسکری عابدی	وحید الحسن ہاشمی کے نوحوں پر ایک نظر (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)
۲۔	نواز حسن زیدی پروفیسر	سید وحید الحسن ہاشمی کی نوحہ نگاری (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)

۹۔ نثر

۱	سید عبداللہ ڈاکٹر	مباحثے کا فن اور وحید الحسن ہاشمی (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)

۲۔ علاؤالدین صدیقی علامہ — فن خطابت اور وحید الحسن ہاشمی (ایضاً ۱۹۹۸ء)
۳۔ انور سدید ڈاکٹر — سید وحید الحسن ہاشمی کی تنقید (ایضاً)
۴۔ محمد فخر الحق نوری ڈاکٹر — سید وحید الحسن ہاشمی کی تنقیدی جہتیں (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)
۵۔ نواز زیدی پروفیسر — وحید الحسن ہاشمی کی نثری (ماہنامہ شام و سحر ۲۰۰۲ء)

۱۰۔ گفتگو (انٹرویو، مکالمہ)

۱۔ اختر ہاشمی — سید وحید الحسن ہاشمی سے ایک ملاقات (روزنامہ حریت کراچی ۱۷۔ جنوری)
۲۔ باقر علی شاہ پروفیسر وزہیر جعفری — سید وحید الحسن ہاشمی سے چند باتیں (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)
۳۔ اختر سعیدی — جنگ کراچی ۲۳۔ اکتوبر ۲۰۰۲ء

۱۱۔ منظوم خراج تحسین

۱۔ نیساں اکبر آبادی — وہ ہستی کونسی ہے جو نمایاں اور اعلیٰ ہے...... (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)
۲۔ عاصم گیلانی سید — کوچہ نعت میں قدم رکھا...... (ایضاً ۱۹۹۸ء)
۳۔ جعفر بلوچ پروفیسر — نگارندۂ دفتر آگہی...... (وحید عصر لاہور ۱۹۹۸ء)
۴۔ نروش ترابی پروفیسر — ایک عہد معتبر ہے وحید الحسن کی ذات...... (ایضاً ۱۹۹۸ء)
۵۔ طاہر ناصر علی — دیار شعر و سخن میں سنا دیا تو نے...... (ایضاً ۱۹۹۸ء)
۶۔ مظفر نقوی — ہیں منفرد کمال کے حامل وحید عصر...... (ماہنامہ شام و سحر لاہور دسمبر ۲۰۰۲ء)
۷۔ موسیٰ کلیم نظامی — نہ کسی گلبدن کی بات کرو...... (ایضاً ۲۰۰۲ء)
۸۔ علی جسیم ہمدانی — ستائش نظا پنجتن کے لئے...... (ایضاً دسمبر ۲۰۰۲ء)
۹۔ اختر ہاشمی — چمک رہا ہے زمیں کے ورق پہ نام اس کا...... (شام و سحر لاہور جولائی ۲۰۰۱ء)
۱۰۔ رضا عباس رضا ایڈووکیٹ — محمد خدا ہو نعت رسالتمآب ہو...... (شام و سحر لاہور دسمبر ۲۰۰۲ء)
۱۱۔ علی رضا کاظمی — اہل ادب کے قلب میں گھر ہاشمی کا ہے...... (ایضاً دسمبر ۲۰۰۲ء)
۱۲۔ خوشتر علی خوشتر — جو بشر تذکرہ کرب و بلا کرتا ہے...... (ایضاً دسمبر ۲۰۰۲ء)
۱۳۔ طارق عزیز ڈاکٹر — تہذیب فکر عظمت افکار کی دلیل (ایضاً دسمبر ۲۰۰۲ء)
۱۴۔ ظفر چشتی پروفیسر — تیرے کلام سے ہے نہ میرے سخن سے ہے...... (ایضاً دسمبر ۲۰۰۲ء)

۱۵۔ حشمت علی قیصر — منتا جو چاہتا ہے کمالِ سخن کی بات...... (ایضاً دسمبر ۲۰۰۲ء)

۱۶۔ ظہور حیدر جارچوی — کہنے کو العطش یہ کتابِ وحید ہے...... (العطش مراثی وحید الحسن ہاشمی ۱۹۸۹ء)

۱۷۔ عرفی ہاشمی — شبِ ادب میں اُجالوں کا استعارہ ہے...... (شام و سحر لاہور دسمبر ۲۰۰۲ء)

۱۸۔ علی کوثر نیازی — جس دم وحیدِ عصر وحید سحر ہوا...... (ایضاً دسمبر ۲۰۰۲ء)

فہرست کتب

(جن میں سید وحید الحسن ہاشمی کا تذکرہ موجود ہے)

۱۔ ضمیر اختر نقوی — اردو مرثیہ پاکستان میں
کراچی — شیخ شوکت علی اینڈ سنز — ۱۹۸۲ء

۲۔ طاہر حسین کاظمی سید ڈاکٹر — اردو مرثیہ انیس کے بعد
دلی — ایرانین آرٹ پرنٹرز — ۱۹۹۷ء

۳۔ شبیہ الحسن ڈاکٹر — ترجیحات
لاہور — اظہار سنز — ۱۹۹۸ء

۴۔ عبدالکریم خالد — چند اور مضامین
لاہور — زیر طبع — ۲۰۰۳

۵۔ ہلال نقوی ڈاکٹر — بیسویں صدی اور جدید مرثیہ
کراچی — محمدی ٹرسٹ — ۱۹۹۶ء

۶۔ عارف ثاقب ڈاکٹر — تحقید
لاہور — الرزاق پبلی کیشنز — ۱۹۹۸ء

۷۔ احسان دانش — جہانِ دانش — (جلد سوم

۸۔ محمد فخر الحق نوری ڈاکٹر — توضیحات
لاہور — پولیمر پبلی کیشنز — ۲۰۰۰ء

۹۔ عباس رضا پروفیسر — وحید عصر
لاہور — الحسن پبلی کیشنز — ۱۹۹۸ء

۱۰۔ شبیہ الحسن ڈاکٹر — اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار — لاہور — اظہار سنز — ۲۰۰۴ء

تحقیقی مقالہ

۱۔ عنبرین خان — سید وحید الحسن ہاشمی۔ شخصیت و فن (مقالہ) ایم۔ اے اُردو گورنمنٹ ایف سی کالج لاہور ۱۹۹۳ء

۲۔ عظمیٰ عزیز — اُردو شاعری میں سلام نگاری۔ قیام پاکستان کے بعد (مقالہ) ایم۔ اے اُردو گورنمنٹ ایف سی کالج لاہور ۱۹۹۲ء

فلیپ

(سید وحید الحسن ہاشمی کی مختلف کتابوں پر لکھے گئے فلیپ)

۱۔ عبادت بریلوی ڈاکٹر	آغا سہیل ڈاکٹر	طاہرین (وحید الحسن ہاشمی) لاہور	۱۹۸۸ء
۲۔ احمد ندیم قاسمی	وحید قریشی ڈاکٹر	العطش (مرثیے) ج:۳ لاہور	۱۹۸۹ء
۳۔ احمد عقیل روبی پروفیسر		العطش (مرثیے) ج:۱۳ لاہور	۱۹۹۸ء
۴۔ خورشید رضوی ڈاکٹر		یاسین (مجموعہ نعت) لاہور	۱۹۹۷ء
۵۔ وحید قریشی ڈاکٹر		تشنہ لب ہے حسین (سلام) لاہور	۱۹۹۹ء
۶۔ انور سدید ڈاکٹر		اوراق لاہور	۲۰۰۲ء

وحیدِ عصر سید وحید الحسن ہاشمی کا شمار ہمارے عہد کے ان اکابرین میں ہوتا ہے جنہوں نے عمر بھر شعر و ادب کی آبیاری کی ہے۔ ان کی پچاس سے زیادہ تصنیفات اس بات کا ثبوت ہیں کہ انہوں نے متنوع اور نادر موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور اپنے افکار عالیات سے انہیں مالا مال کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی ہر تخلیق چشمِ معتبر میں جگہ پاتی ہے۔

"سید آلِ رضا کے خطوط اور اصلاحیں" وحید الحسن ہاشمی کی ایک منفرد تحقیقی کتاب ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے محض اپنے استادِ گرامی حضرت آلِ رضا کے خطوط ہی یکجا نہیں کیے بلکہ زبان و شعر کے حوالے سے ان نادر نکات پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کی عصرِ حاضر میں ضرورت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ وحید الحسن ہاشمی نے ایک گم شدہ عہد کو بھی محفوظ کیا ہے اور شعری اصلاح سازی کی اس روایت کو بھی زندہ کرنے کی سعی کی ہے جو اب نایاب ہوتی جا رہی ہے۔ یہ کتاب شعر و ادب کے شائقین کے لئے ایک دستاویز ہے جس سے بیش از بیش فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن

۳۔ مارچ ۲۰۰۳ء

۲۵۹۔ الیف

رحمان پورہ اچھرہ، لاہور